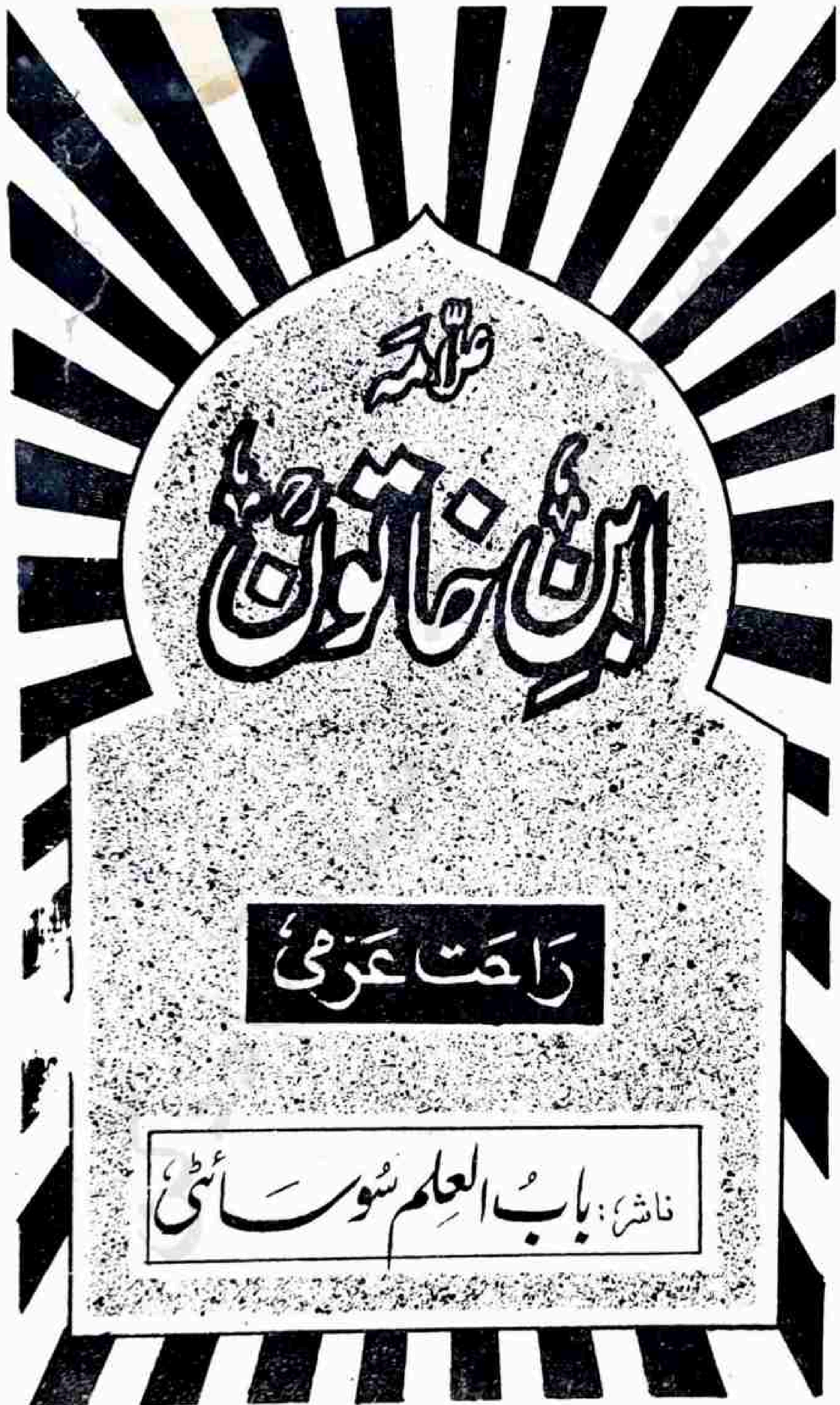
علّامہ ابنِ خاتون علیہ الرحمہ

راحت عزمیؔ


علامہ
ابنِ خاتون
راحت عزمی
ناشر: باب العلم سوسائٹی

نام کتاب : علّامہ ابن خاتون
تعداد : (۱۰۰۰)
مصنّف : راحت عزمی
کتابت : محمّد عبدالرؤف
قیمت : (۶۰) روپے

مِلنے کے پتے :

1. قائم جعفری ۱۵۸-۳-۲۲ دارالشفاء حیدرآباد
2. سلمان بک ڈپو روبرو عبادت خانہ دارالشفاء حیدرآباد
3. کُتب خانہ تُرابیہ دیوان دیوڑھی روڈ حیدرآباد



راحت عزمی

ایک تاثر ــــ چند لفظ ــــ چند حقائق

تاریخ سے ادب کا رشتہ اِتنا ہی نازک ہوتا ہے جتنا فنکار سے وقت کا رشتہ۔ جس طرح وقت کے بہتے ہوئے سمندر کا ہلکا سا ارتعاش بھی فنکار کے ذہن پر اپنا ایک، اثر چھوڑتا ہے اِسی طرح تاریخ کا ہر سانحہ ادب کے لئے ایک عنوان بن جاتا ہے۔ لیکن تاریخ اور ادب کا یہ مضبوط ربط قوس قزح کے اُن رنگوں کی طرح ہے جو انفرادی حیثیت میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں لیکن جب ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو ایک ہی دکھائی دیتے ہیں۔

ادب کی طرح تاریخ کا مزاج بھی وقت کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ کبھی تاریخ صرف شہنشاہوں، حکمرانوں، بادشاہوں اور راجاؤں کے اچھے یا بُرے کارناموں کا خلاصہ ہوتی تھی جسے اُس دور کا مورخ اپنے مزاج اور اپنی حیثیت کے مطابق مرتب کرکے عوام کے اذہان کو مرعوب کرنے کے لئے پیش کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت کا مزاج بدلتا گیا تاریخ کا انداز بھی بدلتا گیا اٹھارویں صدی کے پہلے نصف حصّہ تک پہنچتے پہنچتے تاریخ شاہوں کے افسانے کو چھوڑ کر عوام کی تحریکات، جد و جہد اور ایک نئے نظامِ حکومت کی تلاش میں دلچسپی لینے لگی۔ اب مورخ کا نظریہ صرف حقائق کی "تلاش نہیں رہا بلکہ ان حقائق کے اسباب و نتائج کے تجزیہ پر مرکوز ہو گیا۔ تاریخ فہمی کا یہ موڑ اُسے ادب سے زیادہ قریب لانے کا باعث بنا۔ تاریخ اور ادب کا وہ واضح فرق جو صدیوں سے چلا آرہا تھا پھر بھی موجود رہا مورخ حقائق کا متلاشی اور اُن کے اسباب و نتائج کا کاتب ہوتا ہے۔ اسی لئے اُسے حقائق کی ترتیب میں حصہ لینے والے کرداروں کی سیکالوجی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور نہ وہ واقعات کے زیرِ اثر کرداروں پر مرتب ہونے والے جذباتی اور فکری اثرات سے تعلق رکھتا ہے لیکن

ادب واقعہ سے زیادہ واقعہ کے کرداروں پر اثر اور اُن کے عمل اور ردِ عمل کو مرکز بناتا ہے۔ اسی لئے ادب میں لفظ اپنے ظاہری معنی کو چھوڑ کر علامت کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ تاریخ اور ادب کے اِس واضح فرق کے باوجود نہ ادب تاریخ کے بغیر حرکت کر سکتا ہے نہ تاریخ ادب کے بغیر۔ اِس حقیقت کے قبول کر لئے جانے کے باوجود بھی ان دونوں کے ربط کو سمجھنے اور اُسے لفظوں کا جامہ پہنانے میں یہ مشکل درپیش آتی ہے کہ اکثر مورخ ادب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اُن میں وہ ادبی رجحان نہیں پایا جاتا جو انھیں ادب کے شہ پاروں سے تاریخ کے حقائق کو الگ کرنے اور انھیں مربوط کر کے کسی دور کے سماجی اور تہذیبی انداز کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے۔

یہ یقیناً مسرّت کی بات ہے کہ ادھر کچھ ادیبوں نے تاریخ کو اپنا مرکز بنا لیا ہے۔ میرے بزرگ دوست محترم راحت عزمی انھیں میں سے ایک ہیں۔ انکی شخصیت تاریخ اور ادب کا سنگم ہے۔ معتبر ادیب، منفرد شاعر اور مایہ ناز مورخ ہیں۔ اپنی شخصیت کے ہر رُخ پر راحت عزمی صاحب نے اپنے واضح نقوش چھوڑے ہیں۔ بے حساب ادبی مقالے، ان گنت شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کی مشہور تاریخی کتاب "تاج محل" اُن کا نمایاں کارنامہ ہے "تاج محل" کی جیسی پذیرائی ہوئی اور اُسے ادبی اور تاریخ کی دنیا میں جو مقام ملا اُس سے متاثر ہو کر راحت عزمی نے تاریخ دکن کی اُس مایہ ناز شخصیت پر کام کیا ہے جو قطب شاہی سلطنت کی تاریخ میں بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ علامہ ابن خاتون پر یہ مکمل تحقیقی اور مبسوط کتاب جو مکمل طور پر اُس دَور کے ماخذوں کو استعمال کر کے لکھی گئی ہے مورخین کے ذہنوں میں اُٹھنے والے کئی اہم سوالات کا جواب مہیا کرتی ہے۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کی سلطنت کے قیام کے بعد ہی سے ایک طویل عرصہ تک حکمرانوں اور علما کے درمیان ایک طویل کشمکش شروع ہوئی جو کبھی کم اور کبھی واضح صورت میں تقریباً مغلیہ سلطنت کے زوال تک

باقی رہی اِس کشمکش میں جب کبھی علماء کو حکمرانوں پر فوقیت حاصل ہوئی تو حکمرانوں کو مذہبی رواداری کی پالیسی کو چھوڑ کر تنگ نظری اور مذہبی تعصب کی پالیسی اپنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ شاید اسی لئے دَورِ وسطیٰ کی تاریخ میں علماء کا طبقہ بدنام ہوا۔ دَورِ وسطیٰ کی تاریخ پر پڑے اِس بدنما داغ کو بڑے طویل عرصہ تک دھویا نہ جاسکا اِس لئے مورخین کے نزدیک ہندوستان کے دَورِ وسطیٰ کی تاریخ صرف اور صرف شمالی ہند کی مسلم مملکتوں تک ہی محدود رہی۔

حال حال ہی سے دکن کے مورخین نے اپنی تاریخ کو مرتب کرنا شروع کیا۔ دکن کی پانچ سلطنتوں کی تاریخ پر کام اب بھی ہورہا ہے اور اب تک بھی دکن کی مسلم سلطنتوں کی تاریخ کے نقوش ایسے واضح نہیں ہوئے ہیں جیسے ہونے چاہئیں۔ دکن کی تاریخ اور خاص طور پر قطب شاہی دور پر تحقیق سے جو سب سے بڑا فائدہ ہوگا وہ یہ ہے کہ علما کے گروہ پر تنگ نظری کا جو داغ تاریخ کی حقیقت مانا جاتا رہا ہے آسانی سے دُور کیا جاسکے گا۔

دورِ قطب شاہی کے آغاز ہی سے گولکنڈہ میں علما کی خاصی تعداد جمع ہوئی۔ ان میں سے بڑی تعداد اُن علما کی تھی جو ایران اور اس کے اطراف کے ممالک سے گولکنڈہ پہنچے تھے۔ اِن میں سے کم از کم چار عالم ایسے تھے جنھیں سلطنت کے نظم ونسق میں اقتدار حاصل تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے حسین شاہ ولی کو دس ہزار سوار و(د) کی سپہ سالاری عطا کی تھی اور انھیں محکمہ تعمیرات کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ ابراہیم نے اپنی بیٹی خیرات النساء بیگم کا عقد بھی حسین شاہ ولی سے کیا تھا۔

بانیٔ شہرِ حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کے یمین السلطنت علامہ میر مومن تھے۔ علامہ نہ صرف اپنے دَور کے جیّد عالم تھے بلکہ اپنے علمی تبحّر اور اپنی بصارت و بصیرت کے لئے ساری مسلم دُنیا میں مشہور تھے۔

علامہ ابن خاتون اِن ہی کے معتبر شاگرد تھے جو محمد قطب شاہ کے

یمین السلطنت تھے۔ علما کے درمیان علامہ بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔
شاہ راجو جو عالم کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے ابوالحسن قطب شاہ کے پیرو مرشد تھے۔ گولکنڈہ کے آخری حکمران ابوالحسن قطب شاہ نے اپنی ابتدائی زندگی کے چودہ سال ان ہی کی خانقاہ میں گزارے تھے۔
قطب شاہی سلطنت پر علما کا اتنا اقتدار اور اتنے طویل عرصہ تک موجود رہنے کے باوجود بھی کبھی کسی حکمران کے دور میں یوں نہیں ہوا کہ اُسے تنگ نظری اور مذہبی تعصب سے کام لینا پڑا ہو ایسا کیوں کر ہوا اِس کو مکمل اور واضح طور پر سمجھنے کے لئے ان علما کی زندگی اور اُن کے مذہبی نظریات کو سمجھنا ضروری ہے۔ اِس رُخ پر اب تک کوئی واضح کام نہیں ہوا ہے۔ جتنا کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ یا تو مقالوں کی صورت میں ہے یا مختصر رسالوں کی صورت میں۔
محترم راحت عزمی صاحب قابلِ مُبارک باد ہیں کہ انھوں نے اِس سلسلہ کی پہلی کتاب پیش کی ہے۔
اگر راحت عزمی صاحب کی کتاب میں صرف علاّمہ کی سیاسی سوجھ بوجھ ملکتی امور میں اُن کے قابلِ قدر کارنامے ہی ہوتے تو میں اپنے اس مختصر سے تعارفی مضمون کو یہیں ختم کر دیتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور ادب کا حسین امتزاج ہے۔ راحت عزمی صاحب نے علاّمہ کی زندگی کے تینوں رُخ یعنی مذہبی، ادبی اور ملکتی بڑی تفصیل کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔
علاّمہ شیعہ اثنا عشری کے اُن جیّد علما میں سے ہیں جنھوں نے مذہبی علوم کو دل کھول کر نوازا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ علاّمہ کے یہ مذہبی شہ پارے اب تک بھی مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں اِس لئے دُنیا اب تک ان سے واقف نہیں ہو سکی ہے۔ راحت عزمی صاحب نے علاّمہ کی تمام مذہبی تصنیفات کا مختصر سہی لیکن جامع تعارف کرایا ہے جس سے علاّمہ کی مذہبی حیثیت اور اُن کے علمی تبحر کا تعارف ہوتا ہے۔ یہ اتنا آسان کام بھی نہیں تھا کہ کچھ دنوں کی تلاش اور کاوش سے پورا ہو جاتا۔ راحت عزمی صاحب

کے ذوقِ تجسس اور اُن کی علمی کاوشوں کی داد دینی پڑے گی کہ اُنہوں نے علاّمہ کی تمام تصنیفات کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ اُن کا گہرا مطالعہ کر کے اُن کی قدر و قیمت کو دُنیا کے سامنے واضح کیا۔

علاّمہ کی شخصیت کا تیسرا پہلو اُن کے اَدبی کارنامے ہیں۔ میرے خیال میں علاّمہ کی شخصیت کے اِس رُخ کا تعارف سب سے کٹھن مرحلہ تھا۔ اِس لئے کہ علاّمہ کی شاعری کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے تاریخ کے مختلف مخطوطات میں بکھرا ہوا ہے۔ اِس بکھرے ہوئے مواد کو اکٹھا کرنا اور پھر علاّمہ کی ادبی حیثیت کو اُجاگر کرنا آسان کام نہ تھا۔ مشکل یہ بھی تھی کہ علاّمہ کے معیاری فارسی اشعار کو سمجھنا اور اُن پر قلم اٹھانا جُوئے شیر لانے کے مماثل تھا۔ جناب راحت عزمی صاحب نے اس مشکل کو بھی بخیر و خوبی حل کیا ہے۔ جناب راحت عزمی صاحب کی یہ کتاب اِسی لئے تاریخ مذہب اور ادب تینوں کے اسکالرس کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

کتاب کی ایک اور خصوصیت اِس کی METHODOLOGY ہے عام طور پر اُردو کی تحقیقی کتابیں قدیم اور OUT DATED METHODOLOGY پر اساس کر کے لکھی جاتی ہیں۔ اِن کتابوں میں حوالے یا تو ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو اِتنے نامکمل کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ راحت عزمی صاحب نے اپنی کتاب LATEST METHODOLOGY کے مطابق لکھی ہے۔ جس کے لئے وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔

آخر میں مجھے یہ ضرور لکھنا ہے کہ پچھلی نصف صدی سے اُردو میں سوائے زبان واَدب کے تحقیق کا کام نہیں کے برابر ہو رہا ہے۔ علمی اور تحقیقی کتابیں اور مضامین اُردو کے جاننے ماننے اور اُردو سے والہانہ عشق کرنے والے بھی انگریزی زبان ہی میں کرتے ہیں۔ جس کا مستقبل میں یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ اُردو صرف تمدن کی زبان بن کر رہ جائے گی جس میں ادبی کام تو ہوگا لیکن علمی اور تحقیقی کام ختم ہو جائے گا۔ اس سے زبان اور زبان کی افادیت پر جو اثر

پڑے گا وہ تباہ کن ہوگا۔ اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ مختلف مضامین کے تحقیق اور علمی کارنامے اُردو میں پیش کئے جائیں تاکہ اُردو کے قاری اور زبان کے چاہنے والوں کے ذوق اور علمی تجسس کو تسکین ہو۔

راحت عزمی صاحب کو میں اُن کے اِس عظیم کارنامے پر مُبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ مستقبل میں اِسی طرح ہمیں اپنی علمی کاوشوں سے نوازتے رہیں گے۔

۸۷

ڈاکٹر صادق نقوی
ریڈر شعبہ تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

قطعۂ تاریخ

به سلسلۂ طباعت "علّامہ ابن خاتون"

جنابِ عزمی کا دوسرا یہ بڑا ہے تحقیقی کارنامہ
اور اپنی تالیف کا بھی چُن کر انہوں نے رکھا ہے نام موزوں
سنِ مسیحی میں طبع کا سن، لکھا ہے اس طرح مَیں نے حامی!
کتاب ایک عُمدہ چھپ گئی ہے بنامِ علّامہ ابنِ خاتون

۱۹۹۴ء

جناب ابراہیم علی صاحب حامی

مہدی بھائی[1]

خفا نہ ہوں تو معذرت کے ساتھ کچھ عرض کروں۔ یا تو وہ اصرار تھا کہ پناہ بخدا یا یہ خاموشی جیسے کوئی تعلق نہیں۔ آپنے لکھا مسودہ کا کیا ہوا میں نے کہا لکھ رہا ہوں۔ پھر خط آیا جلدی کر دیں نے لکھا رفتار بہت تیز کر دی ہے۔ تیسرا خط آیا کہاں تک پہنچا۔ میں نے لکھا مکمل ہو چکا ہے حکم ہو تو بھیج دوں۔ خط آیا۔ رمضان کی عید کے دوسرے دن یہاں سے چلوں گا۔ تیسرے دن میں وہاں ہوں مہدی بھائی آپ ہی بتائیے اس جملہ سے کوئی کیا سمجھے گا؟ یہی نا کہ آپ عید کے تیسرے دن حیدرآباد پہنچ رہے ہیں آپکو اندازہ ہے میں کتنا خوش تھا۔ مسودہ سامنے رکھے گھڑیاں گنتا رہا۔ وقت پہاڑ بن گیا تھا عید جیسے بہت دور چلی گئی۔

عید آئی، دوسرا دن بھی گزرا۔ اور پھر خبر ملی کہ آپ نے ہم سے اچانک ہمیشہ کیلئے منہ موڑ لیا ہے۔ آخر کیوں۔ مجھ سے بھی منہ موڑ لیا۔ میرا قصور۔ اس مسودہ کا کیا ہوگا۔ آپنے سارے ہندوستان میں شمال سے جنوب تک مشرق سے مغرب تک اس کتاب کا چرچا کر دیا۔ جلد سے جلد شائع کرنے کی آرزو بھی تھی۔ پھر یہ سناٹا کیسا۔ یہ منہ موڑ لینا کیا معنی۔ کیا صادق الوعدہ ایسے ہی ہوتے ہیں یا غریب کو کتاب شائع کرنے کا یقین کیوں دلایا تھا۔ کیا امید دل سے بھرے ہوئے دل کو یوں توڑ دیا جاتا ہے۔ یہ مسودہ سامنے رکھتے ہوئے کیسا انتظار کرتا رہا۔ آپ سوچ سکتے ہیں۔ ایک آپ کے منہ موڑ لینے سے مجھ پر کیا گزری ہے۔ اور یہ کہ سارے حیدرآباد میں شہرت کہ مہدی بھائی میری تالیف "علامہ ابن خاتون" کو خاص اہتمام سے دلی میں چھاپ رہے ہیں۔ رسم اجرا کی تقریب ہوگی۔ کون کون اس تقریب میں شریک ہوگا راحت عزمی کتنا بڑا آدمی ہو جائے گا۔ کیسے کیسے دانشور اسے پہچاننے لگیں گے۔ کیسے کیسے ماہرین ادب و تاریخ سے وہ ملاقاتیں بھی کریگا اور خط و کتابت بھی جاری رکھیگا۔" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

اب آپ ہی بتائیے ان توقعات اور ان امیدوں کا کیا ہوگا۔ ایسا ہی انجان ہو جانا تھا تو یہ مراسلت کس لئے کی تھی۔ یہ امید کیوں دلائی گئی تھی۔ خیر۔ آپ نے سفر بھی وہ اختیار کیا ہے اور اتنے تیز رفتار ہو گئے کہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔

اب سمجھ میں آرہا ہے "عید کے دوسرے دن چلوں گا تیسرے دن وہاں ہوں" اب جو نکا

---

[1] انیس العصر حضرت مہدی نظمی اعلی اللہ مقامہ

ہوں کہ آپ نے اتنا مذبذب جملہ کبھی نہیں لکھا تھا۔ اس آخری خط میں کیوں لکھا۔ اب معلوم ہوا کہ "وہاں ہوں سے مُراد کیا ہے اور آپ کہاں ہیں" آپ مجھ سے ربط رکھنا ہی نہیں چاہتے نہ رکھئے مگر میں کب آپ سے ربط توڑنے والا ہوں۔ میں آپ کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ آپ کی دیرینہ آرزو میں نے پوری کر دی۔ علّامہ ابنِ خاتون شائع کر دی آپ کو بہر حال بالواسطہ شریک ہونے پر مجبور کر ہی دیا۔ قائم جعفری سلمۂ آپ کے بھانجے صاحب ہی نے تو کتاب کے سارے مرحلے طے کئے ہیں۔ میں اسی طرح الگ رہا جس طرح "تاج محل" کی اشاعت کے وقت آپ سے سیکڑوں میل دور تھا۔

آپ کی دیرینہ خواہش کی تکمیل پر ــ مہدی بھائی ــ آپ خوش ہیں نا خُدا آپ کے درجات عالی کرے۔

راحت عزمی ــــــــــــــــ

شکریہ

میں ثقۃ الاسلام مولانا مُلّا اصغر علی صاحب قبلہ زاد لطفہ صدر خواجہ اثنا عشری فیڈریشن (لندن) حجۃ الاسلام سُلطان العلماء مولانا سید رضا آقا صاحب قبلہ مدظلہٗ مجتہد العصر، عالیجناب سیّد عابد حُسین رضوی صاحب مینجنگ ڈائرکٹر چار مینار کو آپریٹیو بنک برادرم سیّد قائم حسین جعفری سلمہٗ اور اپنے بھانجے اکبر علی خاں سلمہٗ کا بیحد ممنون اور شکر گزار ہوں جن کے مالی تعاون سے میری تالیف "علامہ ابن خاتون علیہ الرحمۃ" بھاری تعداد میں شائع ہو سکی۔

میں عالیجناب میر طاہر علی خاں صاحب صدر امام زمانہ مشن اور عالیجناب سلیم پیر بھائی صاحب و محترم سیّد تقی مہدی صاحب کا سپاس گزار ہوں جن کی توجہ کے باعث مالیہ کی فراہمی کے راستوں کو ہموار کرنے میں بڑی مدد ملی۔

میں ڈاکٹر صادق نقوی صاحب ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ کا خاص طور پر ممنونِ کرم ہوں اور دُہرا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنی انتہائی علمی مصروفیتوں اور اس سے زیادہ ناسازی مزاج کے باوجود اپنے قیمتی پیش لفظ سے نوازا اور فلسفہ تاریخ و سوانح کے بعض اہم گوشوں سے روشناس کرایا۔ اسی کے ساتھ میں ڈاکٹر زیب حیدر صاحبہ ریڈر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے علامہ کے مشکل اشعار کو سمجھنے میں میری مدد فرمائی اور اس دور کے فارسی ادب کے شعری مزاج سے واقف کرایا۔

میں خاص طور پر سالار جنگ میوزیم کے ڈائرکٹر عالیجناب ڈاکٹر نگم صاحب کا بے حد ممنون و شکر گزار ہوں کہ انہوں نے علامہ کی شبیہہ، عکس تحریر اور عکس دستخط حاصل کرنے کی اجازت دی اسی کے ساتھ اسی میوزیم کی نہایت اہم اور قیمتی لائبریری کے شعبہ مخطوطات کے ذمہ دار عہدیدار ڈاکٹر رحمت علی صاحب شعبۂ انگریزی مطبوعات کے کتب خانہ دار شری رمیش صاحب اور شعبہ اردو کے مطبوعات کی عہدیدار محترمہ سیدہ لطیف النساء صاحبہ و نیز ان تینوں شعبوں کے عملہ کا ذرّاً

فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں اِن حضرات نے مواد کے فراہم کرنے میں میری ہر ممکن مدد بھی کی اور سہولت بھی مہیا کی۔ میں جناب محمدؐ عمر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی ملوکہ کتابیں مجھے پڑھنے کے لئے دیں۔

میں میر کرامت علی خاں صاحب ریسرچ آفیسر گورنمنٹ اوریئنٹل مینسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا سپاس گزار ہوں کہ موصوف نے مواد کی فراہمی میں امکانی مدد کی۔ میں محترمہ رفعت رضوانہ صاحبہ کا بھی ممنون ہوں کہ مخطوطات کے مطالعہ کے سلسلہ میں سہولت مہیا کی۔

میں مولوی عبدالرؤف صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کاتبین کی روایت کو توڑ کر میرے مسودہ کی کتابت کی اور میں وعدہ خلافی کی اذیت سے محفوظ رہا۔ میں اعجاز پرنٹنگ پریس کے مالک جناب نُور محمدؐ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے عام تجارتی توجہ سے ہٹ کر اس کتاب کی طباعت میں شخصی دل چسپی لی۔ کتاب کی صورت گری کے ابتدائی مرحلے سے آخری مرحلے تک برادرم سیّد قائم جعفری سلمۂ اِدارۂ خاشاراں مظلومؔ، جناب رشید سہیدی سلمۂ جناب محمدؐعلی وفا سلمۂ اور جناب رضا موسوی سلمۂ میرے دست و بازو بنے رہے مجھے اپنے دست و بازو کا شکریہ ادا کرنا کچھ اوپری سا لگا اِس لئے خلوصِ دل سے "دُعائیں دیتا ہوں میں اپنے دست و بازو کو"

آخر میں میں اپنے عزیز ترین قدیم ساتھی جناب ابراہیم حامی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ازراہِ خلوص و محبّت میری کتاب کے قطعہ تاریخ سے مجھے سرفراز کیا۔

فہرس



علّامہ ابنِ خاتون علیہ الرحمہ



سلطان محمد قلی قطب شاہ



محمد قطب شاہ

باب (۱)

آغاز۔ نام۔ وطن۔ تعلیم و تربیت

علّامہ شیخ محمد ابن خاتون علیہ الرحمہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کے پیشوا تھے۔ اس دور میں حکومت کے وزیر اعظم کو پیشوائے سلطنت کہا جاتا تھا۔ علّامہ قطب شاہی حکومت کے ان علمائے دین میں سے ایک ہیں جن کی وسیع النظری، انسان دوستی، دانشوری، عمرانی سوجھ بوجھ، سماجی کار کے تجربے اور علم و حکمت کی روشنی نے دکنی یعنی قطب شاہی تمدن کو سنوارنے نکھارنے، دلاویز بنانے اور مستحکم کرنے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس میدان میں علامہ کی مسلسل جدو جہد اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ علامہ نے اس مقصد کو پورا کرنے اور اس گنگا جمنی تہذیب کو غیر متزلزل استحکام بخشنے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ انہی کے دور میں پانچویں قطب شاہی تاجدار محمّد قلی قطب شاہ کے دور کی سماجی روایات کا احیا ہوا۔ یہی وہ سماجی رسوم و رواج تھے جن کے آثار آج بھی قطب شاہی ثقافت کی علامت اور شناخت بنے ہوئے ہیں۔

علّامہ ابن خاتون بنیادی طور پر ایک کامیاب معلم و مدرس تھے۔ درس و تدریس سے ان کو فطری لگاؤ تھا۔ انہوں نے قطب شاہی سلطنت میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے بڑے جتن کئے۔ علّامہ اپنے عہد کے مجتہد تھے انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کے حدود میں دکنی تمدن کے پیکر کو تراشا اور فطری حُسن کو نمایاں کرکے اس تمدن میں وہ کشش پیدا کی کہ وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے ماننے والوں کی

علاّمہ حضرت میر محمد مومنؒ کی طرح ہر دل عزیز پیشوائے سلطنت تھے۔ علاّمہ کا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا۔ ان کی پیشوائی کے زمانہ میں ملک کا بین المذاہب اتحاد بہت مضبوط تھا۔ مختلف العقیدہ شہری آپس میں سگے بھائیوں جیسے نظر آتے تھے۔ تہذیبی قدریں محلوں سے لے کر کچے مکانوں تک یکساں آن بان کے ساتھ جگمگاتی نظر آتی تھیں۔

علاّمہ کا نام

ایک تذکرہ میں علاّمہ ابن خاتونؒ کا نام شمس الدین محمّد بن علی بن محمّد بن محمّد بن خاتون العاملی دالعیناثی لکھا ہے اسی تذکرے میں علاّمہ کے دادا کا نام اس طرح ہے: جمال الدین احمد بن نعمت اللہ بن علی بن احمد بن محمّد بن خاتون صاحب حواشی۔ اس لحاظ سے علاّمہ کا نام کچھ اس طرح ترتیب پاتا ہے: "شمس الدین محمّد بن علی بن جمال الدین احمد بن نعمت اللہ محمّد بن علی بن احمد بن محمّد بن خاتونؒ"۔ بعض تذکروں میں "شمس الدین" کے بعد "ابو المعالی اور شیخ" کا اضافہ بھی ملتا ہے۔ اکثر کتابوں میں شیخ محمّد بن علی بن خاتون لکھا ہے۔ عام طور پر علاّمہ کا نام شیخ محمّد بن خاتون لکھا گیا ہے۔ علاّمہ کا سب سے زیادہ معروف نام صرف "ابن خاتون" ہے۔ "روضات الجنّات" میں علاّمہ کے دادا کا نام ایک جگہ "محمّد" اور دوسری جگہ "جمال الدین احمد" لکھا گیا ہے۔ درست نام جمال الدین احمد ہی ہے کیونکہ خود علاّمہ نے اپنے دادا کا نام "جمال الدین احمد" لکھا ہے۔
علاّمہ کے نام کے ساتھ شمس الدین اور ابو المعالی لقب ہیں اور "العاملی دالعیناثی" یائے نسبتی کے ساتھ علاّمہ کے وطن کو ظاہر کرتے ہیں لیکن "عاملی" علاّمہ کا تخلص بھی ہے:

ببرد باری خود عاملی بنا زکہ دہر
رہین خواب گراں، از منی تحمل تست

علاّمہ کا وطن

علاّمہ شمالی عراق کے مشہور سلسلہ کوہ "جبل عامل" کے ایک قریہ عیناث میں پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ کوہ کی اپنی ایک تاریخ ہے کسی زمانہ میں بلاد شام سے "عاملہ" نام کا ایک عرب قبیلہ اس پہاڑ کے دامن میں آکر فروکش ہوا اور اسی سلسلہ کوہ کی زرخیز وادیوں کو اپنا وطن بنالیا۔

آنکھوں کا تارہ بن گیا۔

علامہ ابن خاتون محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کے عہد میں گولکنڈہ آئے درس تدریس سے زندگی کا آغاز کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے آخری دور میں سلطنت سے منسلک ہوئے۔ دور محمد قطب شاہ میں گولکنڈہ کی سلطنت کی جانب سے مملکتِ ایران میں سفارت کی اہم خدمت انجام دی۔ کوئی نو، دس سال اسی ملک میں سفیر رہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے بالکل ابتدائی دورِ حکومت میں ایران سے واپس ہوئے اور نائب پیشوائی کا عہدہ سنبھالا پھر پیشوائے سلطنت بنائے گئے اور زندگی بھر اس منصب پر فائز رہے۔ اور اپنی ابدی آرام گاہ بھی اسی سرزمین دکن کو بنالیا۔

علامہ نے حیدرآباد میں بڑی فعال زندگی گزاری جو آج بھی ہمارے لیے بڑی پرکشش ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید مثال ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ آج کے دور کی طرح بے حساب سہولتیں مہیا نہیں تھیں علامہ کی زندگی کی رفتار طوفانی رہی۔ سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیت ہنگامہ خیز بلکہ حیران کن تھی۔ انھوں نے اپنے محترم استاد حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے منصوبوں کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہ دن رات ہمہ وقت مصروف رہے۔

علامہ کی علمی کاوشیں بھی غیر معمولی رہیں۔ وہ صاحبِ طرز ادیب اور منفرد لب و لہجہ کے شاعر تھے۔ ان کا اپنا ایک اسلوب تھا۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ اپنے ہم عصر شعرأ سے بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ علامہ کا نثری سرمایہ اگرچہ کہ مذہبی ہے لیکن اس کی ادبی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ علامہ کا شعری سرمایہ کسی دیوان کی شکل میں نہیں بلکہ منتشر اشعار کے ذخیرہ کی شکل میں دستیاب ہوا ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا اپنا ایک لہجہ تھا۔ نظم و نثر کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی فکر بھی منفرد تھی اور اسلوب بھی منفرد تھا۔ طرزِ ادا پر قدرت، زبان میں شیرینی اور خیال میں گہرائی و گیرائی تھی۔

قبیلہ کے نام کی نسبت سے اس پہاڑی سلسلہ کو "جبل عامل" کہا جانے لگا۔ یہی اس پہاڑ کی وجہ تسمیہ ہے۔[۲]

"سرکار ختمی مرتبت کی وفات کے بعد ۶۳۴ء میں مسلمان بلاد شام فتح کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ خالد بن ولید کی قیادت میں فتوحات کا آغاز ہوا۔ ۶۴۰ء میں یزید بن ابی سفیان کی قیادت میں شہر "صور" پر قبضہ ہوگیا۔۔۔۔ اب مسلمانوں نے ان مفتوحہ علاقوں پر اپنے اقتدار کو محکم کرنے کے لیے ضروری اقدامات شروع کئے اور مفتوحہ علاقوں کو پانچ منطقوں میں تقسیم کر دیا۔ ۶۴۹ء میں یزید بن ابی سفیان کا انتقال ہوگیا۔ اب خلیفہ ثانی نے متوفی کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ پانچوں منطقے ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک وسیع منطقے میں تبدیل ہوگئے۔ خلافت سوم میں بھی جبل عامل پر معاویہ بن ابی سفیان ہی کی حکومت برقرار رہی۔ اور ان تمام علاقوں میں اسلام پھیلتا رہا۔ اسی زمانہ میں سرکار ختمی مرتبت کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاری یہاں پہنچے اور حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی محبت اور ان سے عقیدت کی تبلیغ شروع کی اسی کے ساتھ یہاں شیعوں کی آبادی کو فروغ ہوا۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں۔۔۔۔ یہاں کشتی سازی کی صنعت قائم ہوئی جس کی وجہ سے اس علاقہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ عباسی حکومت کے محکم ہونے کے بعد اس علاقہ پر بیرونی حملے شروع ہوئے اور یہاں انتشار بڑھنے لگا۔ ۹۰۵ء سے ۹۳۵ء تک یہ علاقہ ایک طرح سے میدانِ جنگ بنا رہا۔ کشت و خون کا بازار گرم رہا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں مصر کے فاطمیوں اور سلجوقیوں کے

اختلافات نے خطرناک شدت اختیار کرلی تھی۔ ان جنگوں کے سبب جبل عامل ایک حکومت کے قبضہ سے نکل کر دوسری حکومت کے قبضہ میں آتا رہا جاتا رہا۔ ۱۵۱۷ء کے بعد ایک بار پھر جبل عامل انقلابات سے دوچار ہوگیا۔ کچھ مدت بعد یہاں عثمانی دور کا آغاز ہوا۔ جبل عامل کی اس دور کی تاریخ کچھ واضح نہیں ہے۔ لیکن ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں شیعوں کو علاقائی خود مختاری حاصل تھی۔"[۷]

صاحب معجم البلدان کے مطابق جبل عامل کی وادیاں جتنی زرخیز ہیں اتنی ہی مردم خیز بھی ہیں۔ اس بہارستان کی کوکھ سے بڑے ہی عظیم المرتبت علماء جلیل القدر دانشور اولوالعزم صاحبان فکر ونظر اور فائز المرام اہل حل وعقد پیدا ہوئے۔ احمد بن محمد اسحاق عاملی ابو یعقوب عاملی، اسحاق بن ہارون عاملی اور شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی وغیرہم نے جبل عامل ہی کی سرسبز وادیوں میں آنکھیں کھولیں اور یہیں پروان چڑھے۔ ان میں کی ہر ایک شخصیت عہد آفریں شخصیت رہی۔ ان بلند پایہ شخصیتوں نے ذہن انسانی کو سیدھے راستے پر قائم اور برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ علامہ ابن خاتون بھی انہی عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ علامہ کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ "عاملی" تخلص رکھ کر اس نسبت کو اپنے نام کا جزو بنالیا۔

علامہ کا گھرانہ

علامہ کا گھرانہ جبل عامل کے قریۂ عیناث کے علمی گھرانوں میں سے ایک علمی گھرانہ ہے۔ علامہ کے والد علی بن جمال الدین احمد ابن خاتون بڑے عالم دین تھے۔ علامہ نے اپنے دادا کے بارے میں لکھا ہے کہ

"شیخ عالم وکامل شیخ جمال الدین احمد بن خاتون کہ جد بیک واسطہ مترجمست ونہایت تبحر در علوم دین داشتہ۔"[۹]

ترجمہ: شیخ عالم وکامل شیخ جمال الدین احمد بن خاتون مترجم کے دادا تھے اور علوم دین میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

علاّمہ کے اجداد میں نعمت اللہ بن خاتون اپنے دور کے جیّد عالم تھے۔ اُنھوں نے امام زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام کی دعاؤں کے مجموعۂ "صحیفۂ کاملہ" جس کو "زبورِ آلِ محمدؐ" بھی کہا جاتا ہے کی تعریف میں ایک نظم کہی ہے۔ یہ نظم عربی میں ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے نعمت اللہ ابن خاتون کی علمی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علیك بتکرار الصحیفه انها ؛ بیض یوم الحشر سود الصحایف

ولازم لها فیها الذی العب بلغه ؛ دعا و حرز عاصم من متخاف

انت دره من بحر علم یمدهٔ ؛ سماوی بالائمه طا یفـ

ومعروفتهٔ فی الناس قد عرقها ؛ عروسا حوت اسنی المعانی اللطایف

علی العابد السجاد و تحیة ؛ نجل من الاحصا او وصف واصف

وابایه الا لمهار خیرة ربهم ؛ وانبایه الا برار کنز المعارف

ترجمہ ا. صحیفہ کو بار بار پڑھو روزِ حشر سیاہ نامہ ہائے اعمال کو سفید کرنے والا ہے

۲. اور اس کا وِرد کرلو کیونکہ اہلِ عقل کے لیے ہر مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اس میں دُعا بھی ہے اور خطروں سے بچانے کا تعویذ بھی۔

۳. ایک علم کا سمندر ہے جو ائمہ کے گرد طواف کرنے والا آسمانی فیض ہے جس کا پانی باڑھ پر رہتا ہے اور اسی میں موتی بن کر نکلا ہے۔

۴. وہ مشہور دلہن کی طرح مہک رہا ہے اور بیش بہا مطالب و لطایف پر مشتمل ہے۔

۵. سیّد سجاد پر ہمیشہ سلام اور اِتنے سلام جو نہ شمار ہوں نہ کسی سے بیان ہوں۔

۶. اور ان کے آبائے طاہرین پر بھی سلام جو برگزیدہ الٰہی تھے اور اولاد ابرار پر بھی جو معارف کا خزانے تھے۔

ابن خاتون کی وجہ تسمیہ

علاّمہ شیخ محمدؐ ابن خاتون ابتدا ہی سے "ابن خاتون" کے نام سے معروف ہیں اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شمالی عراق کے قبیلوں میں یہ روایت تھی کہ جب کوئی قبیلہ اپنے سے اونچے قبیلہ کی لڑکی بیاہ لاتا تو اس لڑکی سے چلنے والی نسل اپنے رتبہ کو اونچا ظاہر کرنے کے لیئے اپنے کو "اِبن خاتون" کہا کرتی تھی، اور اس پر فخر بھی کرتی تھی۔ جو لڑکی مرکز دلہن بن کر آتی

اس کو سارا قبیلہ "خاتون" کہا کرتا تھا۔ طاہر نصر آبادی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"سبب نسبت بہ خاتون آنست کہ یکی از سلاطین دختر خود را بہ یکی از
ابائے ایشاں دادہ بود و ایشاں از نسل آن خاتون اند۔"[۱۱]

ترجمہ: خاتون کی نسبت کا سبب یہ ہے کہ بادشاہوں میں سے کسی نے اپنی لڑکی کا بیاہ
ان کے اجداد میں سے کسی سے کیا تھا۔ یہ نسل اسی خاتون سے ہے۔

صاحب حدائق السلاطین علی بن طیفور بسطامی نے ابن خاتون کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان
کی ہے:

"گویند کہ چوں بزرگوار شیخ نامدار یکی از خواتین قبیلہ نامدار بہ حبالہ نکاح[۱۲]
داشتند از ان زماں درمیاں تازیان آں طبقہ بہ ابن خاتون ملقب گشتند"

ترجمہ: کہا جاتا ہے کہ شیخ کے بزرگوں میں سے کسی نے کسی بڑے اور نامدار قبیلہ کی
لڑکی سے شادی کی تھی! اسی زمانہ سے یہ طبقہ ابن خاتون سے ملقب ہو گیا
[یعنی ابن خاتون کہلانے لگا]

علامہ کی تاریخ پیدائش

کسی تذکرہ نویس نے علامہ شیخ محمد ابن خاتون کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی ہے البتہ بعض قرینوں سے علامہ کی تاریخ پیدائش کا قابل قبول سنہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ صاحب حدائق السلاطین کا بیان ہے کہ:

"جناب شیخ در آوان فترات اواز بکیہ از مشہد رضویہ بجانب دکن
شتافت در سنہ ہزار و نہ داخل بلدہ حیدرآباد شدہ بر حسب
تقدیر در سلک خواص ملازماں سلطنت قطب شاہیہ اختصاص یافت"[۱۳]

ترجمہ: جناب شیخ اس کے بعد مشہد رضویہ سے دکن کی طرف روانہ ہوئے ۱۰۰۹ھ
میں حیدرآباد آئے اور قسمت سے سلطنت قطب شاہیہ کے خاص لازمین
میں منسلک ہو گئے۔

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی علامہ ابن خاتون کی آخری تصنیف "کتاب الامامت" کے
سنہ تالیف پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تالیف ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں مکمل ہوئی

اس وقت علامہ کی عمر (۷۷) سال تھی۔

"ابن خاتون نے تقریباً ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد ۱۰۵۸ھ م ۱۶۴۸ء میں کتاب الامامت کو مکمل کیا۔ یہ مانتے ہوئے کہ ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰-۱ء میں وارد حیدرآباد ہونے کے وقت ان کی عمر (۳۰) سال کی تھی۔ اس لحاظ سے اس کام کی تکمیل کے وقت وہ کم از کم (۷۷) سال کے تھے۔" [۱۴]

علی بن طیفور اور ڈاکٹر اطہر عباس کے بیانات کو مربوط کر کے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ کا سنہ ولادت ۹۷۹ھ تا ۹۸۰ھ ہوگا اور یہ سنہ ہر طرح قرینِ قیاس ہے۔

علامہ کی تعلیم و تربیت

علامہ شیخ محمد ابن خاتون بہت کم عمری میں جبل عامل سے اپنے ماموں شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی صاحب کشکول المعروف بہ شیخ بہائی کے یہاں ایران آگئے تھے[۱۵]۔ اس وقت شیخ الاسلام مشہد میں تھے۔ علامہ نے اپنے ماموں کے آگے زانوے ادب تہہ کیا اور انہی کے زیرِ سایہ ہمہ رخی تربیت حاصل کی۔ علامہ نے بہت جلد علوم دینیہ کے علاوہ علوم مروجہ میں بھی کامل دستگاہ حاصل کر لی۔ اور کم عمری میں فارغ التحصیل ہو کر مشہد ہی میں ایک معلم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت شیخ بہائی شیخ الاسلامی کے عہدے پر مامور تھے۔

دسویں صدی ہجری اختتام کو پہنچ رہی تھی اس وقت ایران میں شاہ عباس صفوی کی حکومت تھی۔ اس زمانہ میں ازبکوں نے ایران پر حملے شروع کر دیتے تھے۔ ازبکوں کا سردار عبداللہ دوم تھا۔ شاہ ایران کی فوجیں عبداللہ دوم کی یورشوں کی تاب نہ لا سکیں۔ اس نے ایران کو شکست دے دی۔ ازبکوں کے ان حملوں سے مشہد تاراج ہو گیا۔ کئی دنوں تک قتلِ عام ہوتا رہا۔ مشہد مقدس بے دردی سے لوٹا جاتا رہا۔ "پرسی سائکس" [PERSY SYKES] کے حوالے سے ڈاکٹر نجمہ صدیقہ نے لکھا ہے کہ:

"شہر پر قبضہ کر لیا گیا ساتھ ہی قتل عام کا بازار گرم ہو گیا مقامات مقدسہ

کی ساری دولت لوٹ لی گئی ۱۰۰۶ھ میں صوبہ کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہوگئی تھی۔" ۱۶

مشہد مقدس کی اس تباہی اور بربادی کے بعد یہاں کے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ ہوگیا تھا۔ علامہ ابن خاتون کا بھی حالات سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ انہیں ایران کی سرزمین تنگ نظر آنے لگی۔ انہوں نے ایران چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے حیدرآباد کا رُخ کیا۔ حیدرآباد ہی علاّمہ کے لیے مناسب ترین مقام ہو سکتا تھا کیوں کہ یہ شہر

عافیت گاہ ہمیشہ سے رہا ان کے لیے
علم و فن جب بھی ہوئے ہیں کہیں آوارہ وطن (راحت عزمی)

علامہ کی حیدرآباد میں آمد کے سلسلہ میں حضرت میر محمد مومن استرابادی علیہ الرحمہ پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ اس زمانہ میں حیدرآبادی تہذیب کو ایک نیا موڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے علامہ ابن خاتون جیسی شخصیتوں کی سخت ضرورت تھی۔

۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۱ء میں علامہ حیدرآباد وارد ہوئے۔ یہاں کے امیروں، رئیسوں اور علماء اور دانشوروں نے علامہ کو بڑے خلوص سے خوش آمدید کیا۔ اور بڑی آؤ بھگت کی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود علامہ کی قدآور شخصیت ہی ایسی تھی۔ وہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی طرح علمی بلندیوں پر فائز تھے دوسرے شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین علیہ الرحمہ کے سعادت مند بھانجے اور شاگردِ رشید بھی تھے۔ شیخ بہاء الدین عاملی اس زمانے میں حکومت کے عظیم ترین عہدے شیخ الاسلامی پر فائز تھے۔ شیخ الاسلامی کا منصب جتنا بلند ترین عہدہ ہے اتنا ہی نازک ترین بھی ہے۔ اس عہدے کے تقاضوں اور ذمّہ داریوں کو پوری توجہ کے ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔

علاّمہ ابن خاتون حیدرآباد میں اپنے علم و فضل، کردار و عمل اور خوش خلقی و خوش بیانی کی وجہ بہت جلد سماج کے ہر حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ علامہ کا ربط حضرت میر محمد مومنؒ سے ورود حیدرآباد کے زمانہ ہی سے رہا۔

علامہ کے حیدرآباد آنے اور سلطنت قطب شاہیہ سے وابستہ ہونے کے درمیان تقریباً ۹ سال کا وقفہ ہے۔ ان ۹، ۱۰ سالوں کے حالات وواقعات کے تعلق سے تاریخ وتذکرے خاموش ہیں۔ البتہ ڈاکٹر ڈودر" (DR DOVARE) کی کتاب "پرشین لٹریچر" (PERSIAN LITERATURE) میں کچھ اشارے ملتے ہیں جن سے اس دور کی مصروفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"میر محمد مومن اور ابن خاتون ابتدائی دور میں مشہور اور قابل اساتذ رہے ہیں۔ کوئی تعجب وحیرت کی بات نہیں ہے اگر علم کی توسیع اور اشاعت کے لیے مذہب وادب کے مختلف درس گاہیں یا ادارے قائم کئے ہوں۔"[۸]

علامہ کی علمی عظمت کو صاحب حدائق السلاطین نے جس طرح بیان کیا ہے اس کو دیکھنے سے ان کی علمی قدآوری کا اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

"از زمرہ علماء ودانشور وفرقہ فضلای بلاغت گستر بود وعلوم دینی ومعارف یقینی را اکثر در مشہد رضویہ ..... بہ تلمذ از خاتم المجتہدین شیخ بہاء الدین طاب ثراہ استفادہ نمودہ در فن بیان ومعانی تبحر تمام داشتہ ودر علوم ریاضی علم اشتہار برافراشتہ چنانچہ مولانا الفتی در مدح شارالداین قطعہ گفتہ

ترجمہ: وہ علما اور دانشوروں کے زمرہ میں تھے۔ ان کا شمار فضلاء میں ہوتا تھا انہوں نے مشہد رضویہ میں خاتم المجتہدین شیخ بہاء الدین طاب ثراہ کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ علوم دین اور عرفانیات کی تکمیل کی۔ فن معانی وبیان میں کامل تبحر رکھتے تھے اور علوم ریاضی میں ان کو خاص مہارت تھی چنانچہ الفتی نے ان کی تعریف میں یہ قطعہ کہا ہے

طراوت گل فضل آب گوہر دانش ؛ مسمی حضرت خاتم فدلوا اہل جہال
شگفتہ گشتہ ریاضی ریاضتش از طبع ؛ شدہ منیر چراغ معانیش زبیال
ندشی عبارت نکات مختصرش ؛ بدان وضوح کہ فہمیدہ طول ازال

ہر آں کہ یک دو قدم در رکاب او پوید ٭ شود سر آمد مشائیاں ز طبع رواں

ترجمہ :- ۱: وہ گلِ فضل کی تازگی اور عقل و دانش کی آب و تاب ہیں۔ وہ ختمی مرتبت جو مالک کائنات ہیں ان کے ہم نام ہیں۔

۲: ان کی طبع کی ریاضت سے گلستان کھل اٹھا۔ ان کے بیان سے معانی کے چراغ روشن ہو گئے۔

۳: ان کی عبارت کی روشنی سے نکات ابھرے ہیں سیکڑوں مطول ان کی وضاحتوں سے سمجھ میں آ گئے ہیں (مطول ریاضی کی مشکل کتاب ہے)

۴: اگر کوئی دو قدم ان کے ہم رکاب ہو تو اس کی طبع رسا ہو جائے اور وہ مشائیوں کے دوش بدوش ہو۔

علامہ ابن خاتونؒ ۱۰۰۹ھ / ۱۶۰۰ء میں گولکنڈہ آئے ابتدائی ۹ سال درس و تدریس میں گزارے اس عرصہ میں وہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ سے منسلک رہے ان کی سرپرستی میں امور مملکت اور انتظامِ سلطنت کے سارے اصول و فروغ اور رموز و اسرار سمجھتے رہے۔ علامہ میں دقیق مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی خداداد صلاحیت تھی۔ وہ ہر پیچیدہ مسئلہ کو سلجھاتے میں غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کی اسی صلاحیت اور فہم و فراست نے حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ بہت جلد پیشوائے سلطنت کی توجہ خاص کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ ان کی مدد سے علامہ نے مدرسہ کھولا۔ صاحب حدائق السلاطین نے صاف طور پر لکھا ہے کہ

زیرِ سرپرستی او (حضرت میر محمد مومنؒ) مدرسہ برپا کردہ و ہموارہ درکار ہائے علمی و ادبی مشغول بودہ میر محمد مومنؒ ہم علامہ ابن خاتون را عزیز داشتہ"۔ ۲۰ے

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی لکھتے ہیں کہ

"حیدر آباد میں انہوں (علامہ ابن خاتونؒ) نے (حضرت میر محمد مومنؒ) کے تحت کام کیا۔ اس تربیت نے ان کی سیاسی اور انتظامی

صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیئے۔" [۲۱]

علامہ کے فطری جوہر کچھ ایسے نکھرے کہ ان کا آوازہ محل اور دربارِ شاہی تک پہنچا۔ بقول ڈاکٹر اطہر عباس کے علامہ کی صلاحیتوں کے اُبھار نے میں حضرت میر محمد مومن نے خصوصی دل چسپی لی تھی اور صاحب حدائق کے بموجب پیشوائے سلطنت حضرت میر محمد مومن علامہ کو عزیز بھی رکھتے تھے اور پھر یہ کہ انھیں ایسے ذہین عالموں اور دانشوروں کی سخت ضرورت تھی تو کیسے نہ ایسی شخصیت کے بارے میں بادشاہ سے کہا ہوگا۔ بہرحال ۱۰۱۹ھ کے اردگرد محمد قلی قطب شاہ نے علامہ ابن خاتون کو مشیرِ سلطنت کی حیثیت سے "سلک خواص ملازماں" میں شامل کرلیا۔ وہ علامہ کو اس سے بھی زیادہ بلند عہدہ دینا چاہتا تھا لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۱۰۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوگیا چنانچہ ڈاکٹر اطہر عباس نے لکھا ہے کہ

> محمد قلی قطب شاہ کی خواہش تھی کہ وہ ابن خاتون کو کوئی اعلیٰ عہدے پر فائز کرے۔ [۲۲]

باب (۱) حوالے

۱: ڈاکٹر زور — کلیات محمد قلی قطب شاہ ص

۲: محمد باقر بن حاجی زین العابدین — روضات الجنات (عربی) ص ۲۲ و ۲۱

۳: اختر حسن — قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸

۴: مختلف تاریخی اور تذکرے جیسے حدیقۃ العالم فارسی۔ حدیقۃ السلاطین فارسی، نجوم السماء (فارسی)

۵: علامہ ابن خاتون — ترجمہ قطب شاہی مخطوط فقہ نمبر ۱ ورق ۹۳ و ۱۲

۶: النور عربی ماہنامہ مطبوعہ لندن شمارہ (۵، ۶) ربیع الثانی و جمادی الاولیٰ

۷: علامہ سہیل آفندی — تلخیص مقالہ من تاریخ جبل عامل — ایضاً

۸ معجم البلدان باب ۹ عامل کو الف ممدودہ سے لکھا گیا ہے لیکن وجہ تسمیہ

کی رو سے عامل درست ہے۔

۹: علامہ ابن خاتون ترجمہ قطب شاہی فقہ امامیہ ورق ۹۳ سالار جنگ میوزیم لائبریری

۱۰: مولانا مرزا محمد حسین سلطینی صحیفہ کاملہ سجادیہ مطبوعہ نظامی پریس ص ۳۴

۱۱: مرزا محمد طاہر نصرآبادی تذکرۃ الشعراء ص ۵۹

۱۲: علی بن طیفور حدائق السلاطین مخطوطہ فارسی ورق ۱۹۵

۱۳: ایضاً ایضاً ایضاً

۱۴: ڈاکٹر اطہر عباس تاریخ شیعت (ہندوستان میں) (انگریزی) ص ۳۲۷

۱۵: شیخ بہاء الدین عاملی علیہ الرحمہ شاہ عباس صفوی کے دورِ حکومت میں جلیل القدر عہدہ شیخ الاسلامی پر فائز تھے۔ وہ اس وقت کے مجتہد اور (۱۰۳) کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ کشکول ان کی مشہور تصنیف ہے انھیں صاحبِ کشکول بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ کے والد اور والدہ اسی زمانہ میں تاتاریوں کے حملوں سے تباہ ہوکر مشہد آگئے تھے۔

۱۶: ڈاکٹر نجمہ صدیقہ مقالہ قطب شاہی دور میں فارسی زبان و ادب (انگریزی) (غیر مطبوعہ) ورق ۵۵

۱۷: اطہر عباس تاریخ شیعت انگریزی (ص ۳۴) ۵۰۶

۱۸: نجمہ صدیقہ مقالہ قطب شاہی دور میں فارسی زبان و ادب (انگریزی) غیر مطبوعہ ورق

۱۹: علی بن طیفور حدائق السلاطین مخطوطہ ورق ۱۹۴

۲۰: ایضاً ایضاً ورق ۱۹۵

۲۱: ڈاکٹر اطہر عباس تاریخ شیعت انگریزی ص ۳۲۱

۲۲: ایضاً ایضاً ص ۳۲۲

باب (۲)

محمد قطب شاہ کا عہد

علامہ شیخ محمد ابن خاتون علیہ الرحمہ ۱۰۰۹ھ میں حیدرآباد آئے، ۱۰۲۰ھ میں قطب شاہی حکومت سے وابستہ ہوئے۔ ۱۰۵۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اس طرح لگ بھگ ۵۰ سال حیدرآباد میں رہے اور ۴۰ سال سلطنتِ قطب شاہیہ کی خدمت کی۔ قطب شاہی تہذیب کو مستحکم کیا اپنے اُستاد حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے خوابوں کو تعبیر دیں۔ صاحب حدائق السلاطین کے اس جملہ سے کہ

> "در سنہ ہزار ونہ (علامہ) داخل حیدرآباد شدہ برحسب تقدیر در سلک خواص ملازمان سلطنت قطب شاہیہ اختصاص یافت"[1]

ترجمہ: ۱۰۰۹ھ میں (علامہ) حیدرآباد آئے اور سلطنتِ قطب شاہیہ کے مخصوص ملازمین میں شامل ہوئے۔

یہ تسامح ہو سکتا ہے کہ علامہ مشہد سے اُٹھے اور حیدرآباد میں قدم رکھتے ہی "سلک خواص ملازماں" سے منسلک ہوگئے۔ صورتحال ایسی نہیں ہے حیدرآباد آنے کے بعد ابتدائی تقریباً نو سال تک حکومت سے متعلق نہیں ہوئے۔ اس مُدت میں علامہ صرف علمی مشغلوں میں مصروف رہے جس میں حضرت میر مومن علیہ الرحمہ سے استفادہ بھی شامل ہے۔ وہ علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں منہمک رہے۔ یہ سلسلہ قطب شاہی حکومت سے مربوط ہو چکنے کے بعد بلکہ عمر کے آخری تک جاری رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُنھوں نے جگہ جگہ مدرسہ کھلوائے اور مدرسین کا تقرر کیا۔ صاحبِ حدیقۃ العالم نے صاف لکھا ہے:

> شیخ محمد بن خاتون علیہ الرحمہ علامۂ زماں بود در آں زمان . . . . .
>
> . . . . . مدارس عالی بنا نمود مدرسین آں مدارس مقرر فرمودند[2]

ترجمہ۔ شیخ محمّد بن خاتون علیہ الرحمہ اپنے زمانہ کے علماء میں سے تھے! انہوں نے اپنے عہد میں کئی مدرسے قائم کیئے، اور مدرسین کا تقرر کیا۔

محمّد قلی قطب شاہ کا انتقال ۱۰۲۰ھ میں ہوا۔ حضرت میر مومن علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کے بھتیجے اور داماد محمّد قطب شاہ کو تخت نشین کر دیا اس تخت نشینی میں حضرت میر مومن علیہ الرحمہ کے تدبیر و تدبر کو بہت زیادہ دخل ہے۔ عام طور پر کسی بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ہی سلطنت کے کئی دعویدار پیدا ہو جاتے ہیں۔ شورش و فساد سے حکومتیں دو چار ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسے دورِ انتشار میں سلطنت کا مستقبل خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ ان حالات سے صاحبانِ تدبر اور ماہرین سیاست ہی نمٹ سکتے ہیں اور اپنی سیاسی بصیرت سے کام لے کر حالات کو ہموار بھی کرتے ہیں اور پُر امن بھی رکھتے ہیں علامی و فہامی حضرت میر مومن علیہ الرحمہ پیشوائے سلطنت نے کمال حسن تدبر سے حالات کو قابو میں رکھا اور کسی اُلجھاؤ کے بغیر محمّد قطب شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

محمّد قطب شاہ کی تعلیم و تربیت حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کی نگرانی میں ہوئی۔ اور بادشاہ بالطبع نیک تھا۔ اچھے اساتذہ اور عمدہ اتالیقوں نے اِس کی نیک سرشت کو اور بھی جلا دی۔ یہ شہزادہ بے شک ایک جوان صالح تھا بادشاہ ہوا تو متقی اور پرہیزگار بادشاہ کہلایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو خون خرابہ سے سخت نفرت تھی اس کو جنگ و جدل قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس نے چودہ سال حکومت کی اور سلطنت کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا پروفیسر عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ

> "گولکنڈہ کی تمام تاریخ میں سلطان محمّد قطب شاہ کا اکیلا عہد ایسا ہے جو پورے سکون اور خاموشی سے گزرا۔ نہ گھر میں کوئی سیاسی بے چینی محسوس ہوئی نہ حدود سلطنت پر کوئی جنگ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا خوشگوار زمانہ اس کے پہلے گزرا نہ تھا نہ اس کے بعد کیوں کہ اس کے عہد کے سوا ہر زمانہ میں سلطنت کچھ نہ کچھ جنگ و جدل کے

لپیٹ میں آئی۔ صرف سلطان محمّد کا عہد ایسا ہے جس میں تمام حدود سلطنت ہر قسم کے سیاسی خلفشار سے محفوظ تھے۔ ملک کا ہر شخص آرام کی نیند سوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی سلطان محمّد کے چچا (محمد قلی قطب شاہ) نے اپنی انتھک کوششوں سے سلطنت کی فضا خوشگوار اور حدود سلطنت ایسے محفوظ کر دیتے تھے کہ ملک میں ہر جگہ اطمینان تھا تمام ہمسایہ طاقتیں ایسی مغلوب ہو چکی تھیں کہ اب ان کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں تھا۔ چنانچہ سلطان محمّد کو ان طاقتوں کے خلاف کبھی جنگ و جدل کرنے کی کوئی ضرورت داعی نہیں ہوئی۔۔۔۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو سلطان محمّد کے پاکیزہ اخلاق اور مذہب پرستی کی بدولت ملک میں رونق اور سنجیدگی پائی جاتی تھی، سلطان محمّد ایک پیکر اخلاق اور مذہب کا شیدائی تھا۔ ان بلند اوصاف کی بدولت اہل ملک اس کو دل سے چاہتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے دائرہ اخلاق سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ بچپن سے وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور ہر روز صبح کی نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔۔۔ مذہبی عقائد میں اپنے دادا ابراہیم قطب شاہ کا پیرو اور وسیع مشرب رکھتا تھا۔" [۱]

محمّد قطب شاہ نے جب تختِ سلطنت پر قدم رکھا تو اس وقت دو عظیم شخصیتیں حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ اور علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ خاتم سلطنت کے ایسے دو نگینے تھے جن کی چکا چوند سے جبین مملکت دمک رہی تھی۔ خود بادشاہِ وقت کے اعلیٰ اوصاف عمدہ کردار، پاکیزگیٔ نفس زہد و تقویٰ کا نور انہی بزرگواروں کی خاص توجہ کا رہینِ منت تھا۔ حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ نے شہزادگی کے زمانہ میں محمّد قطب شاہ کی تربیت میں خصوصی دلچسپی لی تھی قابل اساتذہ کا تقرر کیا تھا۔ باکردار و باعمل اتالیق مقرر کئے تھے۔

محمّد قطب شاہ سیاسیات ملکی کا بھرپور شعور رکھتا تھا۔ اس میں ملکی انتظامات

اور توازن قوت کو قائم رکھنے کی بڑی اچھی صلاحیت تھی۔ حیدرآباد کی مشرقی شاہ راہ پر ایک قلعہ بند شہر سلطان نگر آباد کرنے کے منصوبہ میں اس کی سیاسی سوجھ بوجھ کو زیادہ دخل ہے۔ اس نے سلطان نگر کی بنیاد اسی لیے ڈالی تھی اور قلعہ کی نیو اسی لیے رکھی تھی کہ بے حصار شہر حیدرآباد بیرونی امکانی حملوں سے محفوظ رہ سکے۔ سلطان نگر کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ قلعہ سے باہر عیدگاہ تک بن چکی تھی (یہ عیدگاہ پرانی عیدگاہ کے نام سے آج تک قائم ہے اور یہاں عیدین میں نمازیں بھی ہوتی ہیں) لیکن اس کے اچانک انتقال کی وجہ سے سلطان نگر کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی۔ البتہ جو آثار اب تک موجود ہیں وہ بادشاہ کی سیاسی بصیرت کے غماز ہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ بڑا مردم شناس بادشاہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کا انتقال ہو گیا تو سلطنت کے اس سب سے بڑے عہدے کے لیے اس نے سارے عمایدین سلطنت اور امرائے عظام و نیز سلطنت کے اعلیٰ عہدیداروں کو کھنگالا لیکن اس منصب جلیلہ کے لیے کسی کو اہل نہیں سمجھا اور پیشوائی کا قلمدان تاحیات اپنے ہی پاس رکھا۔ اس بادشاہ کی ہمہ رخی بصیرتوں کو جلا دینے میں اس کا گہرا مطالعہ بھی شامل ہے۔ اس کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کے انتقال اور محمد قطب شاہ کی جانشینی کی خبر جب ایران پہنچی تو شاہِ ایران عباس صفوی نے اپنے سفیر حسین بیگ قبنچاچی کو پیامِ تعزیت و تہنیت دے کر گولکنڈہ روانہ کیا۔ حسین بیگ قبنچاچی گولکنڈے میں تین سال رہا۔ جب ۱۰۲۵ھ میں ایران روانہ ہونے لگا تو محمد قطب شاہ نے اپنا سفیر اس کے ہمراہ کرنا چاہا۔ سفارت کا مسئلہ تھا۔ احتیاط ضروری تھی۔ اس منصب کے لیے ایسا شخص موزوں ہو سکتا تھا جس کو ملک کی داخلی اور خارجی پالیسی پر عبور ہو۔ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ نے اس منصب کے لیے علامہ ابن خاتون کا انتخاب کیا جو ہر لحاظ سے درست تھا کیونکہ حضرت ہی نے ان کو سیاسیات ملکی کی تعلیم دی تھی اور اس جوہر کو خوب ابھارا اور نکھارا تھا۔ اس کا ثبوت علامہ کا چالیس سالہ دورِ ملازمت ہے۔ بادشاہ نے پیشوائے سلطنت کی سفارش منظور کی اور علامہ کو گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے حسین بیگ کے

ساتھ روانہ کیا۔

علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے کوئی ۱۰۰۹ سال ایران میں سفارتی فرائض انجام دیئے۔ علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے اپنے دَورِ سفارت میں نہ صرف ایران اور گولکنڈہ کے دوستانہ تعلقات کو مضبوط بنایا بلکہ قطب شاہی سلطنت کے وقار کو بھی بلند کیا اور اسے بنائے رکھا۔ کوئی دس سال کے بعد ۱۰۳۵ھ میں علامہ حیدرآباد واپس ہوئے اس وقت علاّمہ کے ساتھ مازندران کا سپہ سالار قاسم بیگ بُرہان ایران کے سفیر کی حیثیت سے حیدرآباد آیا تھا۔

علامہ ابن خاتون ایک ایسے زمانہ میں حیدرآباد لوٹے تھے جبکہ سلطنت قطب شاہیہ کے نیک نفس اور ہر دلعزیز تاجدار محمّد قطب شاہ اور حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ جیسے خدا رسیدہ پیشوا دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت میر محمّد مومن کا ۱۰۳۴ھ میں اور محمّد قطب شاہ کا ۱۰۳۵ھ میں انتقال ہوا۔ سلطنت حیدرآباد پر ایک نازک دور آگیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ بہت کم سن تھا۔ ویسے چار مینار سے اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا جا چکا تھا ساتھ ہی جگہ جگہ عبداللہ کی بادشاہت کی ڈھنڈوری پٹوائی اور اس مسرت میں عوام میں منوں شکر تقسیم کی جا چکی تھی مگر بادشاہ کی کم سنی اور دوسری سیاسی صورتوں سے جو ایسے موقعوں پر پیدا ہوتی ہیں ہمسایہ مملکتیں کچھ بھی کر سکتی ہیں و نیز درون خانہ بھی ہنگامۂ شر و فساد ممکن ہوتا ہے۔ ایسے نازک حالات میں علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کا حیدرآباد واپس آجانا حکومت کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ علاّمہ کی آمد پر نظام الدین صاعدی نے جو قطعہ کہا ہے وہ سارے ملک کے جذبات کا ترجماں ہے۔

چو آمد شیخ اِسلامی ز ایران ؛ ضا آمد ز روی او بہر چشم
خرد بہرور و دش گفت تاریخ ؛ چو جاں آمد بجسم و نور در چشم

ترجمہ: جب شیخ اِسلام (علامہ) ایران سے آئے گویا ان کے روئے زیبا سے ہر آنکھ میں نُور آگیا۔ ان کی آمد پر عقل نے اس طرح تاریخ کہی ہے کہ گویا جسم میں جاں اور آنکھوں میں نُور آگیا ہے[5]

محمد قطب شاہ کے انتقال سے قطب شاہی حکومت میں ہلکی سی سیاسی ہلچل کا امکانی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کیوں کہ وارث تخت و تاج بہت کم سن تھا اس کے علاوہ سلطنت میں حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ جیسی کوئی دوسری شخصیت بھی نہیں تھی جو حالات کو قابو میں رکھتی ایسے نازک موقع پر عبداللہ قطب شاہ کی ماں حیات بخش بیگم[1] اور دادی خانم آغا نے بڑے تدبر سے کام لیا۔

محمد قطب شاہ کا انتقال ۱۳؍ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو ہوا۔ وقت نازک تھا۔ کسی ہنگامہ، شر، فساد کی پہلے ہی سے روک تھام ضروری تھی۔ حیات بخش بیگم بادشاہ کی تدفین کے ساتھ ہی کسی تاخیر کے بغیر بدامنی کے ہر امکان کو ختم کرنے کی طرف متوجہ ہوئی، اس نے سب سے پہلے شہر کی نگرانی کے لیے منصور خاں وزیر کو مقرر کیا۔ ملک الیاس اور ملک یوسف کو منصور خان کی مدد کے لیے ساتھ کر دیا۔ شہر پر کڑی نگرانی کے لیے قاسم بیگ کو توال کو مقرر کیا۔ قاسم بیگ کوتوال ادھر چادڑی پر پہنچا اُدھر اس کا نائب حسن بیگ چار مینار پر نگرانی کے لیے آیا۔ اس انتظام سے مطمئن ہونے کے بعد بادشاہ کی تدفین کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۴؍ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ کو محمدی محل میں عبداللہ تخت نشین کر دیا گیا۔ ساتھ ہی چار مینار سے اس تخت نشینی کا اعلان کیا گیا اور سارے شہر میں ڈھنڈوری پٹوائی گئی۔ آناً فاناً یہ انتظام حیات بخش بیگم کے تدبر کا ثبوت ہے۔ تخت نشینی کے مسعود موقع پر:

> "پرانے دستور کے مطابق ملک کے تمام چھوٹے بڑے عہدیداروں کو خلعتیں دی گئیں، سادات، علما، اور طلبا کو وظائف و انعامات دیئے گئے۔ ہاتھیوں اور رتھ گاڑیوں میں شکر بھر کر تمام راستوں اور بازاروں میں تقسیم کی گئی۔۔۔۔ اور نئے بادشاہ کے نام کا سکہ ڈھالا گیا۔ مولانا ردلفی نے ع "مزین شد جہاں از جلوس عبداللہ" (۱۰۳۵) اور فقیر سراج نے جو دربار کا شاعر تھا ع "شد شاہ دکن قطب زماں عبداللہ" (۱۰۳۵) سے تاریخ تخت نشینی اخذ کی۔"[2]

حیات بخش بیگم

حیات بخش بیگم محمد قلی قطب شاہ بانی حیدر آباد کی اکلوتی بیٹی تھی. اس کی ماں شاہ میر شاہ کی بیٹی تھی. شاہ میر کی معزولی کے بعد اس خاتون کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ محمد قلی قطب اپنی لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا تھا. حیات بخش بیگم حسن صورت و سیرت میں اپنی آپ مثال تھی. بادشاہ نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا تھا. اس کے سیرت و کردار اور حسن کا آوازہ ایران کے شاہی محل میں گونجا تھا. شاہ ایران نے اپنے لڑکے کے لیے حیات بخش کو مانگا تھا اغرلو سفیر ایران کی حیدر آباد آنے کی غرض ہی اس خواستگاری کے لیے تھی. اس رشتہ سے دونوں مملکتوں کی دوستی کو مستحکم کرنا بھی تھا ابوالقاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ گولکنڈے کے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ شاہ ایران ایسے بڑے اعزاز سے اسے نوازے کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی گولکنڈہ جیسی چھوٹی سی ریاست کی شہزادی سے کرے۔ یہ رشتہ محمد قلی قطب شاہ کو پسند بھی تھا. حالات اجازت دیتے تو حیات بخش بیگم شہنشاہ ایران کی بہو بن کر ایران چلی جاتی لیکن یہاں کی سیاسی صورتِ حال بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اس رشتہ کو حضرت میر محمد مومن بھی پسند کرتے تھے اگر یہ شادی ہو جاتی تو دونوں ملکوں کی دوستی بڑی مستحکم ہو جاتی.

صورتحال یہ تھی کہ محمد قلی قطب شاہ کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی بادشاہ روز بروز اپنی زندگی سے مایوس ہوتا جارہا تھا. اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہنے والا ہے. اولاد نرینہ تھی نہیں جو کسی جو کھم کے بغیر وارث تخت و تاج ہوتی. بادشاہ نے اپنے بھتیجے محمد قطب کو بڑے چاؤ سے پالا تھا اس کی خواہش تھی کہ تخت و تاج کا وارث اس کا بھتیجا ہو اس نے وصیت بھی کی تھی. ادھر اس کا بھائی خدابندہ تخت کا دعویدار تھا. دکنی اُمراء اور عمائدین اس کی تائید کر رہے تھے. حضرت میر محمد مومن کو بادشاہ کی آرزو معلوم تھی. خدابندہ کا گروہ تخت کو حاصل کرنے کے لیے ماحول بنا رہا تھا ان حالات میں اگر حیات بخش کی شادی ایران کے شہزادے سے ہو جاتی تو یہ بات محمد قلی قطب شاہ کے مقصد

کے خلاف ہوتی۔ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ نے اپنی پسندیدگی کے باوجود اس رشتہ کی مخالفت کی اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ فوراً حیات بخش بیگم کی شادی اِس کے بھتیجے سلطان محمد سے کر دی جائے۔ بادشاہ نے پیشوائے سلطنت حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کا مشورہ قبول کر لیا اور ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء کو حیات بخش بیگم کی شادی سلطان محمد سے کر دی گئی۔ اس وقت سفیر ایران اغرلو گولکنڈہ میں موجود تھا۔ اس نے اس شادی میں شرکت بھی کی[8]

حیات بخش بیگم بڑی مدبر خاتون تھی۔ اس نے اُمور سلطنت میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا تھا اس کو حکومت کے داخلی اور خارجی اُمور پر کامل عبور تھا۔ اس میں مسائل کو سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ مورخ خافی خاں کے بیان سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ:

"حیات بخش بیگم کہ عورت غضبناک تیز ہوش و رسا بود احد سے را در مقدمات سلطنت دخل نہ داد خود بہ نفسِ نفیس بہ انتظام مملکت می پرداخت۔[9]

ترجمہ: حیات بخش بیگم غضبناک نہایت ہوشمند اور ذہن رسا رکھنے والی خاتون تھی۔ سلطنت کے مقدموں میں کسی کو دخل دینے کی روادار نہ تھی۔ مملکت کا انتظام وہ خود کرتی تھی۔

اس نے عبداللہ قطب شاہ کو امور سلطنت سونپنے تک انتظام مملکت کی ساری ذمہ داری خود سنبھالے ~~رکھی~~ رکھی

خانم آغا

خانم آغا محمد قلی قطب شاہ کے بھائی محمد امین کی بیوی سلطان محمد (محمد قطب شاہ) کی ماں اور عبداللہ قطب شاہ کی دادی تھی۔

یہ بھی بڑی سوجھ بوجھ کی خاتون تھی۔ بشریف الخاندان سیدانی تھی۔ اس کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ قطب شاہی فوج کے امیر لشکر سید کمال الدین مصطفیٰ خان کے عزیز میر مقصود علی کی بیٹی تھی۔[10] قطب شاہ سیادت سے اپنا رشتہ جوڑنا سعادت سمجھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ عالی نسبی دربار کی زینت سمجھی جاتی تھی۔

حیات بخش بیگم اور خانم آغا نے سب سے پہلے کم سن شہزادے عبداللہ کو تخت نشین کردیا۔ اس کے فوراً بعد ایک مجلسِ تولیت بنائی جس کی صدر خود حیات بخش بیگم تھی۔ یہ مجلس امورِ سلطنت کی دیکھ بھال کرتی تھی اور کاروبارِ سلطنت بھی انجام دیتی تھی۔ حیات بخش بیگم سمجھتی تھی کہ سلطنت کے کلیدی عہدوں کا خالی رہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس نے خانم آغا کے مشورہ سے شاہ محمد کو پیشوائے سلطنت بنایا شاہ محمد عبداللہ قطب شاہ کا پھوپھا اور خانم آغا کا داماد تھا۔ دبیری کے عہدہ پر محمد رضائے استرآبادی کو حسبِ سابق بحال رکھا۔ منصور خان حوالدار کو میر جملہ بنایا کیوں کہ یہ شخص ملک و مالک کا وفادار تھا۔ مرزا روزبھان کو سرخیلی کا عہدہ دیا گیا۔ ناظر الممالک کے عہدہ پر میر قاسم کا تقرر کیا گیا۔ اعتماد راؤ کو ہندی فرامین نویسی پر اور نارائن راؤ کو مجموعہ داری پر مقرر کیا گیا۔ قاسم بیگ کوتوالی پر اور حسن بیگ نائب کوتوالی پر بحال رہے۔ محل کے اندر بھی مناسب ردوبدل کیا گیا۔ یہ تقررات فی الحال بہت ضروری تھے۔

باب (۲) حوالے

۱: علی بن طیفور — حدائق السلاطین مخطوطہ ورق ۱۹۵

۲: میر ابوالقاسم — حدیقۃ العالم ص ۳۵۵

۳: عبدالمجید صدیقی — تاریخ گولکنڈہ ص ۶۴ و ص ۱۶۳

۴: عبدالمجید صدیقی — تاریخ گولکنڈہ ص ۱۶۴

۵: نظام الدین — حدیقۃ السلاطین ص ۴

۶: عبداللہ قطب شاہ کی ماں کا نام حیات بخش بیگم ہے کسی غلطی کی وجہ سے حیات بخشی بیگم مشہور ہوگیا ملاحظہ ہو سنگ مزار، حدیقۃ السلاطین ص ۱۰۲، ص ۱۳۳، حدیقۃ العالم ص ۳۴۱، ۳۵۹ قطب شاہی ص ۲ شجرہ قطب شاہی سنگ مزار کی عبارت ہے۔
"وفات جنت مکانی حیات بخش بیگم بتاریخ بست و ہشتم شب سہ شنبہ شعبان ۱۰۸۸ھ"

۷: عبدالمجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ ص ۱۷۱

۸، ۹، ۱۰: عبدالمجید صدیقی ص ۱۷۲، ص ۱۷۲، ص ___

باب (۳)

علامہ علیہ الرحمہ کی سرکاری مصروفیت

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کا دورِ ملازمت

۱۰۲۰ھ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ ۱۰۱۹ھ کے اواخر میں یا ۱۰۲۰ھ کے اوائل میں سلطنت قطب شاہیہ سے منسلک ہوئے محمد قلی قطب شاہ نے مشیر سلطنت کی حیثیت سے علامہ کا تقرر کیا۔ ۱۰۲۰ھ میں محمد قلی قطب کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بھتیجا اور داماد محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ علامہ اپنے منصب پر برقرار رہے۔ ۱۰۲۵ھ میں سفیر ایران حسین بیگ قبچاچی جو بادشاہِ وقت کو شاہِ ایران کا پیام تعزیت وتہنیت دینے کی غرض سے آیا ہوا تھا جب اپنے وطن لوٹنے لگا تو گولکنڈے کے سفیر کو ایران بھیجنے کا سوال پیدا ہوا، حضرت میر محمد مومن کی سفارش پر علامہ کو گولکنڈے کی طرف سے ایران کا سفیر مقرر کیا گیا اور بادشاہ کے لیے تحائف کے ساتھ وہ حسین بیگ کے ہمراہ ایران روانہ ہوئے علامہ نے ایران میں تقریباً (۹) سال حسن وخوبی کے ساتھ سفارت کے فرائض انجام دیئے اور ایک چھوٹی سی مملکت کے وقار کو ایران کی شہنشاہیت سے منوایا اور اس کے مقام کو بلند رکھا۔

۱۰۳۴ھ میں حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کا اور ۱۰۳۵ھ میں قطب شاہی خانوادے کے چھٹے تاجدار محمد قطب شاہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ سلطنت میں حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ جیسا مدبر پیشوا تھا اور نہ محمد قطب شاہ جیسا نیک سیرت بادشاہ ایسے نازک وقت میں ۱۳ سالہ عبداللہ قطب شاہ کو تخت نشین کر دیا گیا تھا۔ حکومت نازک مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ ایسے زمانے میں علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نعمت بن کر حیدرآباد

لوٹے۔ سیاسی صورتِ حال ایسی تھی کہ کلیدی عہدوں خصوصاً پیشوائی کے منصب کو مخلو نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے حیات بخش بیگم نے مجلس مشاورت کی تشکیل کے ساتھ ہی خاتم آغا کے مشورے سے اس کے داماد شاہ محمد کو پیشوا بنا دیا تھا علامہ حیدرآباد اس وقت پہنچے جب شاہ محمد پیشوا بن چکا تھا حیات بخش بیگم علامہ کی شخصیت ان کی عظمت اور علمی بلندی سے بخوبی واقف تھی۔ اگر علامہ محمد قطب کے انتقال سے کچھ دن پہلے بھی حیدرآباد آگئے ہوتے تو وہ ہی پیشوا سلطنت ہوتے کیوں کہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے بعد اس عہدہ جلیلہ کے لیے علامہ ابن خاتون ہی سب سے زیادہ موزوں اور اس منصب کے اہل تھے۔ حیات بخش بیگم علامہ کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے آڑے وقت تو ان کی سخت ضرورت تھی۔ سوال یہ تھا کہ کلیدی عہدوں میں کوئی ایسی جائداد نہیں جو علامہ ابن خاتون جیسی قد آور شخصیت کے لیے مناسب ہو۔ حیات بخش بیگم کو علامہ سے امور سلطنت میں استفادہ کرنا بھی ناگزیر تھا اس لیے اس نے فوراً نائب پیشوائی کی جائداد کا اضافہ کیا اور اس جائداد پر علامہ کا تقرر کر دیا۔ اس عمل سے حیات بخش بیگم کے تدبر اور اس کی دانشمندی کا پتہ چلتا ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مغل دربار کا حاجب محی الدین پیشوائے سلطنت شاہ محمد سے اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا جس سے سلطنت کا وقار متاثر ہو رہا تھا۔ حاجب کے جائز و ناجائز مطالبے بڑھتے جا رہے تھے۔ گولکنڈہ کا پیشوا حاجب کو خاطر خواہ جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ یہ بات بھی حیات بخش بیگم کو کھل رہی تھی اس کا پیچ و تاب بڑھ رہا تھا لیکن اس کا تدبر جذبات کو غیر متوازن ہونے سے روک رہا تھا اس نے نہایت ہی حسن تدبیر سے کام لیا۔ علامہ کو نہ صرف نائب پیشوا بنایا بلکہ حسبِ ضرورت دبیری کا عہدہ بھی محمد رضائے استر آبادی سے لے کر علامہ کے سپرد کر دیا۔ وقت ایسا تھا کہ یہ تبدیلی ضروری سمجھی گئی۔ علامہ نے نائب پیشوائی اور دبیری ان دونوں عہدوں کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

نائب پیشوائی کے منصب کا خاص پہلو یہ تھا کہ اس کرسی پر بیٹھنے والے کا

عوام سے راست تعلق ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن خاتون یوں بھی اپنی علمی اور تدریسی معروفیت کے باعث عوام و خواص میں کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ اس عہدے پر آنے کے بعد عوام سے اور بھی قریبی ربط پیدا ہو گیا اور پیشوائے سلطنت معطل سا ہو گیا۔[1] یہ صورتِ حال شاہ محمد کے لیے اذیت ناک تھی۔ علامہ کی طرف سے اس کے دل میں گرہ پڑ گئی اور آئندہ کے حالات نے اس گرہ کو اتنا سخت کر دیا کہ وہ علامہ کے سخت خلاف ہو گیا۔ یہی حال دبیرِ سلطنت محمد رضائے استر آبادی کا تھا۔ وہ بھی علامہ کا مخالف ہو گیا۔

ہوا یوں کہ شاہجہاں نے شیخ محی الدین قزوینی کو اپنا حاجب بنا کر گولکنڈہ روانہ کیا۔ حکومت گولکنڈہ نے حاجب کے حدودِ سلطنت میں قدم رکھتے ہی شاہانہ استقبال کیا۔ اس خوش آمدید اور اکل و شرب میں قطب شاہی میزبانی کے معیار اور سلطنت مغلیہ کے شہنشاہی مزاج کا بھرپور خیال رکھا گیا۔ حاجب کو مرزا محمد امین کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ محمد امین کا باغ، باغ نہیں تھا بلکہ یہاں کی زمین پر فردوسِ بریں تھا۔ حاجب جب عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوا تو اس کو اس کی توقعات سے کہیں زیادہ نوازا گیا۔ اور پھر حاجب جب بھی باریاب ہوتا اسی طرح نوازا جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے (۱۰۰) افراد پر مشتمل عملہ کو بھی حسب حیثیت انعام و اکرام سے سرفراز کیا جاتا۔ حاجب شاہی بذل و عطا اور فراخدلانہ میزبانی سے خوش ضرور تھا لیکن اس نے حکومتی مسائل میں برتری کو ملحوظ ہی نہیں رکھا بلکہ حجابت کے منصب کی حدوں سے تجاوز کر کے اپنے مطالبوں کو منوانے لگا۔ شاہ محمد شاہی حاجب سے مرعوب ہو گیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ:

> حاجب شہنشاہی رعب سے کام لے کر ناجائز فائدے حاصل کرنے لگا اور بہتیرے مطالبے پیش کر دیئے .... پیشوا شاہ محمد ایسے کمزور تھے کہ سفیر کا ترکی بہ ترکی جواب نہ دے سکتے تھے۔[2]

عبداللہ قطب شاہ کو شاہ محمد کی یہ کمزوری بہت ناگوار گزری۔ وہ اب اس عہدۂ جلیلہ پر شاہ محمد کو دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ حالات فی الحال ایسے تھے کہ

پیشوا کو الگ کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ بادشاہ کو موقع کا انتظار تھا کہ شاہ محمد کو سبکدوش کر کے اس عہدے پر موزوں شخصیت کا تقرر کر سکے۔ ظاہر ہے اس وقت موزوں ترین شخصیت صرف علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ ہی کی تھی۔ بادشاہ شاہ محمد کی سبکدوشی کے لیے کسی دوسری معقول وجہ کی جستجو میں تھا۔ عین اسی زمانہ میں شاہ قاضی حوالدار کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ افضل ترکہ کو اس کے قلمدان سے ایسے کاغذات ہاتھ آئے جن سے صاف ظاہر ہوگیا کہ شاہ محمد عادل شاہ والی بیجاپور سے کچھ ساز باز کر رہا ہے۔ شاہ محمد نے یہ کاغذات شاہ قاضی حوالدار سے لکھوا کر عادل شاہ کو بھیجنا چاہا تھا۔ جو اس کے انتقال کی وجہ بھیجے نہ جا سکے خواجہ افضل ترکہ نے حقِ نمک ادا کیا اور وہ کاغذات بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ [۳]

عبداللہ قطب شاہ نے جرم کے پایہ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد ۹ رمضان ۱۰۳۸ھ کو شاہ محمد کو پیشوائی کے عہدے سے معزول کر دیا۔ اس جگہ پر علامہ ابن خاتون کا تقرر کر دیا۔ اس خوشی میں علامہ کے شاگردوں دکن کے دانشوروں عالموں، ادیبوں اور شاعروں نے قطعات تہنیت پیش کئے صاحب حدیقۃ السلاطین نے اپنی تصنیف میں ایک قطعہ تاریخ اور ایک مصرعہ کو جگہ دی ہے۔

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت ٭ کہ خاتم می کند از وی گدائی
ز فرط مرحمت کردہ ... ممکن ٭ محمد را بصدر پیشوائی
متاع فضل و دانش بود کاسد ٭ کنوں بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بداں سال ٭ کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد ایں مصراع تاریخ ٭ محمد یافت از حق پیشوائی
۱۰۳۸ھ

مولانا عرب خوش نویس نے بھی بہت عمدہ تاریخ نکالی ہے۔

"محمد ابن علی پیشوائے سلطان شد" ۱۰۳۸ھ

ترجمہ ۱: (وہ بادشاہ) جو یوسف جمال اور جمشید حشمت ہے حاتم اس کے در کا گدا ہے
۲: [اسنے] اپنے کرم و لطف سے محمّد (علاّمہ) کو پیشوائی کی مسند پر بٹھایا۔
۳: [شہر میں] متاعِ فضل و دانش کا بڑا کال تھا (مگر) اب ان کے عہد میں اس کی فراوانی ہے۔
۴: علم و فضل کی خستہ حالی دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی (ان کی وجہ سے) خلق خدا کی یہ بے نوائی ختم ہو گئی۔
۵: (مجھے) اس مصرع تاریخ کا الہام ہوا (کہ) محمّد (علامہ) حق کی طرف سے پیشوا ہوئے۔

علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے مسند پیشوائی پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اطراف کی ہمسایہ حکومتوں کے حاجیوں یا سفیروں کی طرف توجہ کی۔ ان سفیروں میں پہلا نام شیخ محی الدین قزوینی کا آتا ہے شاہجہاں کے اسی حاجب سے سابق پیشوا شاہ محمد نے گفتگو کی تھی جس میں شاہ محمّد ناکام ہو گیا تھا اور اس ناکامی نے سلطنت کے وقار کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ حاجب کہ جا و بیجا زیادتیاں اور اس کے نامناسب مطالبے حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے شیخ محی الدین سے گفتگو کا از سرِ نو آغاز کیا اور اس کے سارے ناجائز مطالبوں کو سرے سے مسترد کر دیا اور حاجب کے سفارت کے قواعد شکن تجاوز کی شکایت شاہجہاں کے وزیر اعظم آصف خان سے کی اور دوسرے امرا کو بھی محی الدین کے خلاف شکایتی خطوط لکھے[۴] حاجب کی حرکتوں کی اِطلاع شاہجہاں کو ہوئی۔ اس نے نہ صرف شیخ محی الدین کو واپس بلا لیا بلکہ اس کے بے جا اور ناجائز مطالبوں پر سرزنش بھی کی[۵] علامہ نے بہت جلد صورتِ حال پر قابو پا لیا اس کی وجہ یہ تھی مغلیہ دربار کے اُمرا خصوصاً وزیر اعظم سے علاّمہ کے دوستانہ تعلقات تھے اور علاّمہ مغل دربار میں عزّت کی نگاہ دیکھے جاتے تھے بقول:

"شاہجہاں کے وزیر اعظم مرزا ابوالحسن آصف خان سے علامہ

ابن خاتون کی بڑی دوستی تھی اور اس کی وجہ سے دربارِ مغلیہ میں ان کو بے حد رسوخ حاصل تھا۔ قطب شاہی مقبوضات کے بعض سرحدی علاقوں پر مغلیہ فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن علامہ ابن خاتون کی خاطر شاہجہاں نے ۱۰۴۰ھ میں یہ علاقہ عبداللہ قطب شاہ کو واپس دے دیئے۔ [۶]

شیخ محی الدین حاجب کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے دوسرے ہمسایہ ممالک کے سفیروں کی طرف توجہ کی اور گفت و شنید کے ذریعہ سارے مسائل حل کر دیتے۔ شاہجہاں کے سفیر کو شہنشاہی سرزنش کا مستوجب قرار دینا اور معتوب کروانا علامہ کا بڑا کارنامہ بھی ہے اور ان کی قدآور شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ اسی کے ساتھ علامہ کے حسن تدبیر اور سیاسی بصیرت و تدبر پہ بھی روشنی پڑتی ہے اور سلطنت کے امور خارجہ پر علامہ کی گہری نظر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

علامہ کے منصب پیشوائی پر آنے کے بعد یہ پہلا کارنامہ تھا کہ مغل شہنشاہ سے اپنی بات منوالی حاجب کو معتوب کروایا۔ مغل شہنشاہیت کے فیصلہ اور طرز عمل نے دوسری ہمسایہ حکومتوں کے سفیروں کو بہر حال متاثر کیا۔ یہ سفیر بھی اپنے طرز عمل اور رویہ میں محتاط ہو گئے۔

عبداللہ قطب شاہ علامہ کی اس کامیابی پہ بہت خوش تھا کیوں کہ علامہ کی مساعی نے حکومت کے وقار کو بلند کر دیا تھا۔ بادشاہ نے اس مسرت میں علامہ کے اعزاز میں اضافہ کیا شاہی فرمان ہوا کہ علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ کو ایک مخصوص اعزاز سے نوازا جاتا ہے کہ وہ دروازۂ دوازدہ امام سے ندی محل تک اپنی پالکی میں آیا کریں گے۔ اور علامہ کی نشست مسند شاہی قریب مقرر کی گئی [۷]

اس اعزاز کے بعد علامہ کی دیوڑھی پر عوام و خواص کا اژدہام اور بڑھ گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں میں کافی اضافہ ہو گیا لیکن علامہ

نے اپنے فرائض منصبی میں ہلکا سا بھی فرق نہیں آنے دیا۔ بادشاہ نے علامہ کے کثرت کار کو محسوس کر لیا اور خواہش کی کہ وہ دبیری کے عہدے کے لیے کسی موزوں شخص کا انتخاب کریں اور یہ فرائض اس کے سپرد کریں تاکہ کام کا بوجھ ہلکا ہو۔ علامہ نے شاہی حکم کی تعمیل میں دبیری کا قلمدان مولانا اویس کو جو ساتویں قلم پر حاوی تھے عطا کیا۔[۹] اسی کے ساتھ کچھ تقررات بھی عمل میں آئے۔ شریف الملک تو اپنے پہلے عہدے سرخیلی پر بحال رہے البتہ سید محمد کو جو ملک دمالک کے وفادار تھے اور بعض مرحلوں پر حق نمک بھی ادا کیا تھا بادشاہ کے حکم سے پانچ ہزاری منصب عطا کیا ابراہیم پورہ کی جاگیر دی اور انہیں بادشاہ کے مقربان خاص میں شامل کیا۔ علامہ کا دروازہٴ دوازدہ امام سے ندی محل تک پالکی میں آنا معمولی اعزاز نہ تھا۔ یہ اعزاز بادشاہ سے انتہائی تقرب کی علامت تھا۔ اس مرتبہ نے ان کے فرائض میں بھی اضافہ کیا۔ اب حکومت کے سارے کلیدی عہدوں پر شخصیتوں کے انتخاب کے لیے خصوصاً دبیری، سرخیلی، نائب پیشوائی کے لیے بادشاہ علامہ سے مشورہ کئے بغیر کوئی حکم صادر نہیں کرتا تھا۔

علامہ کو پیشوائے سلطنت ہوئے مشکل سے ایک سال ہوا تھا کہ ۱۰۳۹ھ میں بنگال کے مغل صوبیدار باقر خان نے قطب شاہی سرحدی صوبہ کسم کوٹہ کے قلعہ راجمندری پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ قطب شاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے فوراً ایک لشکر راجمندری روانہ کر دیا۔ اس لشکر کا سردار خواجہ افضل ترکہ تھا۔ علامہ نے اس صورتِ حال کی اِطلاع آصف خان کو ضرور دی ہوگی۔ علامہ کی مغل دربار میں عزت تھی۔ شاہجہاں کو فی الحال دو وجہوں سے گولکنڈہ سے تھوڑا سا تعلق خاطر تھا۔ ایک تو یہ کہ شہزادگی کے زمانہ میں جس وقت شاہجہاں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور شہنشاہی فوجیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اس وقت گولکنڈہ کی حکومت نے اسے شاہانہ اعزاز کے ساتھ اپنے ملک سے گزرنے کے لیے راستہ دیا۔ دوسرے علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کا مغلیہ سلطنت میں اثر تھا۔

باقر خان صوبیدار بنگالہ کی فوجیں اور قطب شاہی لشکر میدانِ جنگ میں

صف آرا ہو چکے تھے۔ اِدھر گولکنڈہ میں شاہجہاں کا فرمان پہنچا۔ اُدھر باقر خان کو بھی شاہی حکم روانہ کر دیا گیا تھا۔ جب فرمان گولکنڈہ آیا علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے اس فرمان کو لانے والے کے ہاتھ خواجہ افضل ترکہ کو بھیج دیا۔ فرمان اس وقت ملا جب طبل جنگ بجنے ہی والا تھا۔ باقر خان کو شاہجہاں کا وہ فرمان سُنا یا گیا کہ قلعہ عبداللہ قطب شاہ کے وکیلوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس پہ فوراً عمل ہوا اور ایک امکانی خونریز جنگ ٹل گئی۔[۹] معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

۱۰۴۱ھ میں گولکنڈہ میں سخت قحط پڑا۔ اس سوکھے سے جنوبی ہند کا بہت بڑا رقبہ متاثر ہوا۔ شاہجہاں کا شاہی مورخ عبدالحمید لاہوری اس قحط کو اپنی تاریخ بادشاہ نامہ میں انتہائی متاثر کن انداز میں بیان کرتا ہے۔ حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے حوض، ندی نالے چھوٹے بڑے کنویں سب سوکھ گئے تھے۔ ہر طرف سَو سَو گز زمین کھودی جاتی لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلتا۔ ہر طرف العطش کا شور تھا۔ لہلہاتے باغ چٹیل میدان بن گئے تھے۔ ہرے بھرے جنگل صحرا میں تبدیل ہو گئے تھے لو کے جھونکوں میں بے برگ خشک درختوں کے ڈال ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے اونچے بڑے کوہاں والے اونٹ نڈھال ہو کر اپنی زبانیں باہر نکالے ہانپ رہے ہیں۔ ہر ذی رُوح موت کا نشانہ بن رہا تھا۔ جدھر دیکھو موت منہ کھولے کھڑی تھی جو اس کی زد میں آجاتا اسے نگل لیتی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ بے حد پریشان تھا۔ جس قطب شاہی خانوادے کی انسان دوستی ضرب المثل تھی اس کے ایک تاجدار کے لیے انسانوں کے بے گور و کفن بکھرے ہوئے لاشے سوہانِ روح بن گئے تھے۔ اس نے جگہ جگہ لنگر خانے کھول دیئے تھے۔ شہر کے باہر بہت بڑا لنگر خانہ قائم کیا گیا تھا۔ جہاں آش تقسیم کی جاتی تھی۔ لنگر خانوں میں عوام کا ہجوم ہوتا۔ لوگ اس آش کو نعمت سمجھ کر حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ اناج کی قلت کا یہ عالم تھا جہاں ایک "ہُن" ملنے میں ۱۵ من چاول ملتا تھا وہاں اسی ایک "ہُن" ۱۲ سیر فروخت ہو رہا تھا اور اس بھاؤ میں بھی آسانی سے میسر نہیں ہو رہا تھا یہی حال جوار، باجرہ تیل،

گھی وغیرہ کا تھا۔ جو چیز ایک من میں منوں میں ملتی تھی اب سیروں میں بمشکل سے دستیاب ہو رہی تھی عبداللہ قطب شاہ نے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے اور حکم دے دیا تھا کہ قرب وجوار میں جہاں سے جتنا غلہ مل سکتا ہے خرید لیا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے شہر پہنچا دیا جائے۔

یہ مادی تدبیریں تو مسلسل کی جاتی رہیں۔ غلہ خریدا جاتا رہا حیدرآباد کو آتا رہا لیکن قحط کی شدت ایسی تھی کہ عبداللہ قطب شاہ نے اسے دوسرے پہلو سے سوچا اور سمجھ گیا کہ یہ آفتِ ناگہانی دراصل آسمانی ہے۔ اس آسمانی عذاب سے دُعا کے ذریعہ ہی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ مادی امکانات سے تو اپنی جگہ استفادہ ہوتا رہا لنگر خانوں کے چولھے اس مصیبت کے ٹلنے تک ٹھنڈے نہیں ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ

"محبان حیدر کرار و معتقدان ائمہ اطہار علیہم الصلوٰۃ اللہ مورد الم قلت الامطار سہ روز روزہ گرفتہ روز جمعہ بہ نماز استسقا ءبروند"

ترجمہ:۔ حیدر کرارؑ کے محب اور ائمہ اطہار علیہم الصلوٰۃ کے ماننے والے جو بارش کی قلت کا نشانہ بنے ہیں (وہ) تین روز روزہ رکھیں اور جمعہ کے دن نماز استسقاء کے لیے جائیں۔

اس حکم کے اعلانِ عام کے ساتھ ہی شہر کے تمام علماء فضلاء صلحا اور اتقیا سبھی نے چہارشنبہ و پنجشنبہ و جمعہ تین روز روزے رکھے جمعہ کے دن اداب نماز استسقاء کی پابندی کرتے ہوئے سر و پا برہنہ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے دولت کدے پر جمع ہوئے ان صاحبان زہد و تقویٰ کے ہمراہ شہر کے سارے تاجر تمام سوداگر مسلم اور غیر مسلم عوام و خواص بھی ننگے پاؤں ننگے سر تھے۔ سارا مجمع ندی محل کے سامنے والے میدان میں جمع ہو گیا۔ ایک طرف ہندو بھائی تھے دوسری طرف مسلمان بھائی تھے۔ یہ سب اپنے رازقِ حقیقی سے گڑگڑا کر قحط کی مصیبت سے نجات کی دُعا کرنے آئے تھے۔

"محبانِ حیدرِ کرار" اور مسلمانانِ وطن کی صفیں آراستہ ہوئیں اِدھر

عمدۃ الفضلا قاضی احسن المشہور بہ "قاضی مکہ دخطیب" ان فریادی نمازیوں کی صفوں سے آگے بڑھے نہایت خضوع وخشوع سے نماز استسقاء ادا کی سارے مسلمانوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز ختم ہوئی ائمہ علیہم السلام کی ماثورہ دُعائیں رجوع قلب کے ساتھ گڑگڑا کر پڑھیں۔ ندی محل کے میدان میں وہ شور گریہ بلند ہوا کہ آسمان تھرا گیا زمین لرز گئی آفتاب کانپ اُٹھا۔ عرش کے کنگرے ان فریادیوں کے نالوں سے ہلنے لگے۔ جب مخلوق خدا اپنے "روزی رساں" "خالق آب و خاک" اور "روزی دہندہ ذی حیات" کی بارگاہ میں فریاد کر چکی تو سونے اور چاندی کے سکوں کے انبار اُٹھائے ہوئے اونٹ اور ہاتھی متحرک ہوئے علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے غریبوں، یتیموں، محتاجوں، بیواؤں اور مستحقوں کے علاوہ صالحین، متقین، زاہدین اور عابدین وطن کو حسب مراتب سونے چاندی کے سکے تقسیم کئے۔ اس کے بعد علامہ نے "لنگر فیض اثر" کے حوالدار کو حکم دیا کہ ان ہاتھیوں اور اونٹوں کو لنگر فیض اثر لے جائے اور یہ رقم وہاں کے مستحقین میں تقسیم کردے جب تقسیم کا یہ مرحلہ ختم ہو چکا تو

"وقتِ عصر نواب علامی فہامی (ابن خاتون) با جمیع خلائق فاتحہ از دیاد عُمر و افزائی حشمت خاقان یوسف جمال خواندہ بہ شہر مراجعت نمودند"[12]

ترجمہ: نواب علامہ (ابن خاتون) علیہ الرحمہ نے عصر کے وقت تمام مخلوقِ خدا کے ساتھ بادشاہ کی عمر اور اس کے جاہ وحشم کی زیادتی کے لیے دُعا کی اور شہر کو واپس ہوئے۔

پروردگارِ عالم نے اپنے بندوں کی فریاد سُن لی اس سال شدت کی بارش ہوئی۔ حیدرآباد کے تالاب آبِ باراں سے چھلک گئے۔ شگاف زدہ سوکھے میدان شاداب ہوگئے۔ ہر طرف سبزہ لہلہا اٹھا۔ اہلِ وطن کو قحط کے عذاب سے نجات مل گئی۔ عوام کے چہروں پر شگفتگی کے آثار نظر آنے لگے حکومت کے فراہم کردہ سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ ایک لاکھ انسان اس

قحط کا شکار ہوئے۔ بے شمار مویشی الگ ہیں۔ ان ایک لاکھ آدمیوں کے کفن دفن کا انتظام حکومت نے کیا۔[۳۱]

اسی سال ملا محمد تقی تفرشی سرخیلی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں ہوگیا۔ علّامہ نے بادشاہ سے اجازت لے کر مرحوم کی زوجہ اور دوسرے افراد خاندان کو کافی روپیہ پیسہ دے کر ان کے وطن عراق کو روانہ کر دیا۔ اسی سال سرخیلی کے عہدے پر مرزا حمزہ کا تقرر کیا گیا۔ ناظر الممالک کے لیے میر قاسم چنے گئے میر معز الدین کو مشرف بنایا گیا۔ مجموعہ داری کے عہدے پر نارائن داؤ کا تقرر کیا گیا اور ساتھ ہی طویلہ اور شاہی فیل خانہ کی ذمّہ داری بھی انھیں کے سپرد کی گئی۔

ابھی قحط کے عذاب سے ملک و مالک کو نجات ملی تھی کہ عمائدین سلطنت اور بادشاہ سلامت پھر ایک ناگوار واقعہ سے دوچار ہو گئے۔ عادل شاہ کے فوج کے سپہ سالار مریری نے قطب شاہی حکومت کے خلاف کچھ حرکتیں شروع کیں، عبداللہ قطب شاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مریری کی اس حرکت پر غضبناک ہوگیا اور فوراً جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ اس وقت خارجی حکمت عملی کا تقاضہ یہ تھا کہ تدبر سے کام لیا جائے اور جنگ سے تاحد امکاں گریز کیا جائے۔ لیکن راج ہٹ آخری راج ہٹ ہوتی ہے۔ بادشاہ کا غیظ و غضب تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ صورتِ حال نازک ہو چلی تھی۔ علّامہ نے اس وقت اپنے تدبر سے کام لیا۔ بادشاہ کے غصّہ کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں کیں اور بہت ہی خوبصورتی سے سمجھایا کہ اس وقت شاہی جلال سے زیادہ شاہانہ سنجیدہ فکری کی ضرورت ہے اور بادشاہ سے گزارش کی کہ وہ مسائل کو حل کرنے میں تدبر سے کام لے۔ اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ مریری سے بات چیت کی جائے۔ اسے سمجھایا جائے۔ اس کو اس کی غلطی بتائی جائے۔ اگر وہ اپنی غلطی کو مان لے اور معذرت کرلے تو شاہانہ عفو درگزر کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے ورنہ قطب شاہی افواج قاہرہ کی تلواریں تو برہنہ ہیں ہی شاہی حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ البتہ مریری سے گفتگو کیلئے ایسے شمشیر زن بھیجے جائیں جن کو دیکھ کر ہی مریری قطب شاہی عسکری قوت سے

مرعوب ہوسکے۔ علامہ کی اس تجویز کو بادشاہ نے شرفِ قبولیت بخشا۔ چنانچہ چند بہادر امرا کو منتخب کرکے مرہری کے پاس بھیجا گیا، مرہری سے اس دفد نے گفتگو کی اور بات چیت کے ذریعہ ہی ناگوار بات رفع دفع ہوگئی۔[۱۲]

علاّمہ کی شیخ محی الدین حاجب سے گفتگو میں کامیابی عبداللہ قطب شاہ کی مسرّت کا سبب بنی۔ اس خوشی میں اس وقت اور اضافہ ہوا جب ۷ر رجب ۱۰۴۵ھ کو یہ حاجب اپنے ملک واپس ہوگیا، اس زمانے میں شاہجہاں برہان پور میں تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی طرف سے دفاخان کو شاہجہاں کے پاس روانہ کیا اور قیمتی تحفے ہاتھی گھوڑے اور تیس ہزار ۳۰۰۰۰ ہن بھیجے۔ شاہجہاں نے ادھر شیخ محی الدین کی سرزنش کی یہ اطلاع بھی عبداللہ قطب شاہ کے مزید خوشیوں کا سبب بنی۔ عبداللہ قطب شاہ کو سب سے بڑی خوشی اس وقت ہوئی جب اس کو معلوم ہوا کہ شاہجہاں برہان پور سے اگرے کے لیے روانہ ہوگیا ہے۔

دُنیا کا عجیب و غریب دستور ہے جو لوگ اچھے ہوتے ہیں دُنیا انھیں کے پیچھے پڑجاتی ہے علاّمہ جیسی شخصیت بھی بعض لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔

۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں علامہ ایک سازش کا شکار ہوئے۔ شاہ محمّد کو پیشوائی سے ہٹانے سے پہلے ہی سے علاّمہ کے خلاف ایک ماحول بننا شروع ہوگیا تھا۔ شاہ محمّد کو نائب پیشوائی کے نئے عہدہ کا قیام پسند نہیں تھا کیوں کہ اس کو پیشوائی کی اہمیت گھٹتی نظر آرہی تھی جب علاّمہ پیشوائی کے منصب پر فائز ہوئے اور ادھر مرزا محمّد رضائے استرآبادی سے دبیری لے لی گئی تو علاّمہ کا مخالف گروہ مخالفت میں اور شدید ہوگیا۔ ان لوگوں نے علاّمہ کے خلاف عبداللہ قطب شاہ کے کان بھرنے شروع کردیئے۔ بادشاہ کان کے کچے تو ہوتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی اندیشوں میں محصور رہتی ہے چنانچہ عبداللہ قطب شاہ سازشیوں کی باتوں میں آگیا۔ اس لگائی بُجھائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷ر جمادی الآخر ۱۰۴۳ھ کو عبداللہ قطب شاہ نے علاّمہ کو پیشوائی کے منصب سے علیحدہ کردیا۔ لیکن اس انقلاب سے علاّمہ کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ وہ آرام سے گھر بیٹھ گئے۔ وہ حالات سے متاثر بھی کیوں ہوتے ان کی بنیادی مصروفیت تو

علمی تھی۔ انہوں نے اپنی علمی معروفیت کی رفتار تیز کردی۔ سرکاری ذمہ داریوں کی ادائیگی میں علامہ کے انہماک سے تو ایسا لگتا تھا کہ علامہ کا انہی فرائض کو پورا کرنا ہی سب کچھ ہے لیکن یہ فرائض ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اولیت علوم کی نشر و اشاعت کو دیتے تھے اس عزل و علیحدگی نے علامہ کی روزمرہ زندگی میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ سازشیوں کی یہ سازش کچھ زیادہ دن چلنے والی نہیں ہے جھوٹی پھلجھڑیاں زیادہ دیر تک اپنی بہار نہیں دکھا سکتیں۔ فی الحال عبداللہ قطب شاہ نے اسی مرزا محمد رضائے استرآبادی کو پیشوا بنادیا جس کو دبیری کے عہدے سے الگ کیا گیا تھا۔

اسی زمانہ میں عادل شاہ والئ بیجاپور کا وہی سپہ سالار مرہری جس نے کچھ عرصہ پہلے قطب شاہی حکومت سے چھیڑ چھاڑ کی تھی عادل شاہ کی بڑی بہن کے ساتھ حیدرآباد آیا ہوا تھا۔ اس کو علامہ سے بڑی عقیدت تھی[۱۵] شہزادی کے سارے سرکاری فرائض ادا کرنے کے بعد وہ علامہ سے ملنے آیا۔ اس کو یہاں کے حالات کا علم تھا۔ علامہ سے اس نے تفصیلی حالات سنے اور حقیقتِ حال سے واقف ہوا۔ وہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوا اور بادشاہ کو حقیقی حالات اور سازشیوں کی سازش سے واقف کرایا۔ جب بادشاہ ہر طرح سے مطمئن ہوگیا کہ یہ ایک سازشی چال تھا جس میں علامہ کو پھانسا گیا تھا تو اس نے علامہ کے تکدر اور ملال کو دور کرنے کے لیے

"یکی از مقربان سریر سلطنت با پاندان طلا بخدمت نواب علامی فہامی فرستادند، تنبول دان مذکور را بملازمان علامی بخشیدند و کمال التفات بظہور رسانیدند، بعد از چند روز دیگر تقاریب علامہ را بحضور دافر النور طلب فرموده بہ تشریف خاص نوازش بیش از بیش نمودند و جای صدر الشریعہ صدر جہان، بجہت جلوس ایشان معین گردیدند امور مشورت و مراجعت کہ باعث قوام نظام سلطنت است بہ نسبت سابق بر ہمہ رتبہ مقدم بہم رسانید۔"[۱۶]

ترجمہ:۔ [بادشاہ] نے اپنے مقربین میں سے ایک کو سونے کا پاندان
دے کر علّامہ [ابن خاتون] کی خدمت میں روانہ کیا۔ انھوں نے
اس پاندان کو علّامہ کے ملازمین کے حوالے کیا اس طرح [علّامہ پر
بادشاہ کا] بے حد التفات نمایاں ہوا۔ چند دنوں بعد بادشاہ نے
علّامہ کو یاد کیا اور بے حساب نوازشات سے سرفراز کیا۔ نہایت
اخلاص کے ساتھ [ان کو] صدرالشریعہ صدرجہاں کی جگہ بٹھایا
اور ان تمام اُمور میں جو سلطنت کے استحکام و قیام سے متعلق تھے
مشورہ کیا۔ حسب سابق (علّامہ کے) سارے مرتبوں کو بحال کر دیا۔

بادشاہ نے علّامہ کو یہ اعزاز دے کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ یہ تعطل صرف تین مہینے رہا جو جمادی الاول ۱۰۴۳ھ سے شروع ہو کر شوال ۱۰۴۳ھ کے دوسرے ہفتہ میں ختم ہو گیا۔ ۹ شوال کو جب کہ آفتاب برج حمل میں مقام شرف پہ آیا تو دربار آراستہ کیا گیا تمام اعیان سلطنت اور عمائدین مملکت کے علاوہ مختلف حکومتوں کے سفیر اور کلیدی عہدوں پر فائز عہدیدار اپنے اپنے مقام پر ایستادہ تھے۔ اتنے میں سواریٔ شاہانہ آئی۔ بادشاہ سلامت مسند سلطنت پر بیٹھے اور علّامہ کی طرف توجہ شاہانہ ہوئی انھیں خلعت سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ پیشوائی کے ہم رتبہ عہدۂ میر جملگی کا پیشکش کیا گیا۔ علّامہ نے اِسے قبول کر لیا۔ اس عہدہ کو قبول کرنے کے لیے علّامہ کو پہلے ہی سے آمادہ کر لیا گیا تھا۔ فی الحال مصلحت یہی تھی کہ ایسا ہی ہو۔ ویسے علّامہ اس تلخ واقعہ کے بعد دوبارہ حکومت میں آنے کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن عبداللہ قطب شاہ کو تو علّامہ کی ضرورت تھی حکومت کے نظام میں علّامہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا میر جملگی کے عہدے کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے یہ امتیاز رکھا گیا کہ سونے چاندی سے سجائی گئی پالکی جس کو تلنگانہ کے ماہرین نے بڑی مہارت سے آراستہ کیا تھا جو صرف شاہی سواری کے لیے تیار کی گئی تھی لیکن سواری شاہانہ اس میں ابھی جلوہ افروز نہیں ہوئی تھی علّامہ کو عطا کی گئی۔ بادشاہ نے علّامہ کی مدد کیلئے

ان کے لائق بھانجے شیخ محمد طاہر کو سرخیلی کا عہدہ عطا کیا (حدیقۃ السلاطین ص ۱۴۷ سے آگے) اور علامہ کو یہ یقین بھی دیا جا چکا تھا کہ انھیں پیشوائی کے منصب پر بہت جلد لا لیا جائے گا۔

علامہ کو میر جملگی پر جو بجائے خود پیشوائی کے مرتبہ ہی کا عہدہ ہوا کرتا تھا اس لیے لایا گیا کہ بہت جلد ان کے اپنے منصب پر انھیں دوبارہ فائز کر دیا جائے۔ البتہ دوسرے اعزازات سے نواز کر ان کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا۔ ان میں بہت بڑا اعزاز یہ تھا کہ بادشاہ نے اسی دن مخدوم الملک اور سید بالو کو جن میں سے ہر ایک سو سوار اور ایک ہزار پیادوں کا سردار تھا علامہ کے ماتحت کر دیا اس کے علاوہ چودہ سلحداروں کو بھی علامہ کے تحت کر کے یہ حکم دیا کہ وہ ہر جمعرات کو "روضات کرام سلاطین مغفور" کی زیارت اور فاتحہ خوانی کیلئے علامہ کو لے جایا کریں۔ علامہ وہاں فاتحہ گذرائیں گے۔

"اعلیٰ حضرت خاقان سکندر برائے توقیر و احترام نواب علامی دو سردار یکی مخدوم الملک و دیگری سید بالو..... ہر کدام صد سوار و ہزار پیادہ و چہار دہ سلحدار... حوالہ فرمودند کہ روز پنجشنبہ بہ زیارت روضات کرام سلاطین مغفور... بروند و جمیع مجلسیان و کل سرداران.... ہمراہ نواب علامی می باشند"[۱]

ترجمہ: بادشاہ نے مخدوم الملک اور سید بالو کو جن میں سے ہر ایک سو (۱۰۰) سواروں اور ہزار (۱۰۰۰) پیادوں کا سردار تھا اور چودہ (۱۴) سلحداروں کو بطور توقیر و احترام علامہ کے ماتحت کر دیا کہ (وہ) ہر پنجشنبہ کو سلاطین کے روضوں پر فاتحہ کے لیے جایا کریں۔ علامہ کے ہم نشین اور دوسرے سردار بھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔

علامہ دن میں دو مرتبہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس کے بعد لعل محل میں آتے یہاں سلطنت کے دوسرے دفتری امور انجام دیتے تھے۔

میر جملگی پر آنے کے بعد علامہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن لوگوں کو

سابقہ کئی مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی انھیں تنخواہیں دلوا دیں۔ اس کے علاوہ سلحداروں، علمداروں، سراپردہ داروں اور دوسرے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا علماء صلحا اور دوسرے معزز شہریوں کو علامہ سے بہت فائدے پہنچے۔ اس عمل نے علامہ کو ملک میں اور مقبول بنا دیا۔

اسی دورِ مہر جملگی میں ملکہ حیات بخش بیگم اور خود عبداللہ قطب شاہ دو مرتبہ علامہ کے یہاں مہمان ہوئے اور ہر بار ایک ایک ہفتہ مہمان رہے۔ علامہ نے بھی قطب شاہی روایات میزبانی کی پابندی کی۔ علامہ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ بادشاہ وقت اپنے امیر کے یہاں ایک ہفتہ مہمان رہے۔ ایسی مثال قطب شاہی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ جیسی شخصیت کے یہاں بھی کبھی بادشاہ وقت اس طرح مہمان نہیں ہوا۔ یہ اعزاز صرف علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے لیے مخصوص ہو گیا۔

۳۵۔ ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء کو خیرات خان سفیر گولکنڈہ ایران سے واپس ہوا۔ اس کے ساتھ ایران کا سفیر امام قلی بیگ شاملو گولکنڈہ آیا۔ امام قلی بیگ شاملو ایرانی دربار کا نہایت قابل درباری تھا۔ گولکنڈہ کی حکومت نے اس کا شایان شان استقبال کیا۔ امام قلی بیگ شاملو قندھار کے راستہ سے حیدرآباد آیا تھا۔ اس لیے مغلیہ سلطنت کا بھی مہمان رہا۔ شاہجہاں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ حیدرآباد کے دارالخلافہ میں داخلہ کے موقع پر شیخ محمد طاہر سرخیل سلطنت نے ایرانی سفیر کو خوش آمدید کہا۔ شیخ محمد طاہر کے ہمراہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے سمدھی بولچی بیگ بھی تھے۔ اس کے بعد خود بادشاہ سلامت نے استقبال کیا اور مرزا محمد امین کے باغ میں ٹھہرایا۔ مرزا محمد امین کا باغ رشک بہشت تھا اور ایک طرح سے سرکاری مہمان خانہ بن گیا تھا۔

عین اسی زمانے میں جب کہ عبداللہ قطب شاہ سفیر ایران کی مہمان داری میں مصروف تھا اسے خبر ملی کہ شاہجہاں آگرے سے چل پڑا ہے۔ یہ خبر گولکنڈے کے لیے تشویش ناک تھی۔ عبداللہ قطب شاہ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کو فوراً پیشوائے سلطنت کی مسند پر بٹھا دینا کیوں کہ علامہ ہی کی ایک ایسی شخصیت تھی جو مغل سلطنت کے کسی بھی دباؤ کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۷ر رجب ۱۰۴۵ھ م ۲۷ر ڈسمبر ۱۰۳۵ء کو علامہ پیشوائے سلطنت کے قلمدان سے نوازا گیا بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا کہ جب تک کوئی موزوں شخصیت نہیں مل جائے میر جملگی کا قلمدان بھی وہ اپنے پاس ہی رکھیں۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے اپنے بائیں پہلو میں علامہ کی نشست مقرر کر دی اور یہ بھی حکم ہوا کہ

"نواب علامی فہامی برنسبت منفرت پناہ میر محمد مومن سوار پالکی شدہ بدولت خانہ گیتی نشان امدورفت نمایند"

ترجمہ: حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی طرح پالکی میں سوار ہو کر دولت خانۂ عالیہ تک آیا جایا کرتے تھے۔

اس موقع پر مرزا نظام الدین صاحب حدیقۃ السلاطین نے چھ شعر کا ایک قطعہ تاریخ لکھا جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

پئے تاریخ این پائندہ دولت ❊ زغیب آمد بگوش ہوش آواز
کہ ہم از جانب یزداں وسلطاں ❊ محمد پیشوائی شد شدہ باز

ترجمہ: (۱) اس پائندہ عہدہ کی تاریخ (عطا) کے غیب سے یہ ۱۰۴۵ھ آواز کانوں میں آئی
(۲) خدا اور بادشاہ دونوں کی طرف سے محمد (علامہ) کو دوبارہ پیشوائی مل گئی۔

اسی طرح دیگر بے شمار شعرا نے قطعات تہنیت علامہ کی خدمت میں پیش کئے۔ علامہ کے عہد پیشوائی میں اہلِ علم شخصیتوں کو بہت فائدے پہنچے۔ مرزا قاسم خراسانی ایک قابل شخص تھا۔ اس کا باپ شاہجہاں کے منصبداروں میں تھا۔ علامہ نے ان دونوں کو بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل کیا۔ حکیم نظام الدین کو جو مچھلی پٹنم سے ایران جانا چاہتا تھا بندرگاہ سے گولکنڈہ بلوایا اور حکیم جبرئیل کی جگہ دے کر گولکنڈہ ہی میں روک لیا۔ اخلاص خان کے مکان میں ٹھہرایا اور خزانہ شاہی سے ان کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا حکم دیا۔[۱۸]

سیادت پناہ قاضی القضاۃ قاضی ظہیر الدین نجفی کو کم عمری میں فارغ التحصیل

ہو گئے تھے اور علامہ کے خاص شاگرد تھے علامہ نے دبیری کا عہدہ دیا۔ اُنھوں نے اپنے منصب کو بہت عمدگی سے نبھایا۔ حکیم عبدالجبار گیلانی دولت محل کے مجلسیوں میں سے تھا۔ بہت سُریلی آواز پائی تھی شاہی مجالس عزا میں روضہ خوانی اسی کے سپرد تھی۔ بعد میں اس کو وزیر افواج کا عہدہ بھی دیا گیا علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے جب یہ دیکھا کہ حکیم عبدالجبار اپنے فرائض کو ٹھیک ڈھنگ سے ادا نہیں کر رہا ہے اور بادشاہ کا معتوب بھی ہو گیا ہے تو اُنہوں نے اس کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر دیا اور مرتضیٰ نگر اور معدن الماس کے علاقوں کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔ اسی طرح علامہ نے محمد صالح بیگ اور علی اکبر جُنیدی دکنی کو سرنوبتی کے عہدوں پر مامور کیا سید طاہر دکنی کو اور کریم خان لاری کو پانچ سو لشکری خاصہ سرخیل کے عہدے دیئے۔ میر محمد سعید کو سر دفتر بنایا۔ سرخیلی کا منصب ملّا عبداللہ مازندرانی کو عطا کیا۔[19]

سنہ ۱۰۳۶ھ / ۲۶-۱۶۲۵ء کے گولکنڈے کے واقعات کو مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی پالیسی کا تسلسل سمجھنا چاہیے۔ مغلوں کی نگاہ آز ہمیشہ دکن کو تکتی رہی۔ وقتاً فوقتاً جو حالات پیدا ہوتے رہے وہ مغلوں کی توسیع پسندی کی نمایاں مثال ہے لیکن دکن کی چھوٹی ریاستیں بھی نچلی نہیں بیٹھیں۔ اپنے وجود کی بقا کے لیے اُنہوں نے بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ یہ ریاستیں مغلوں کے ریلے سے گھبرائی نہیں بلکہ منہ توڑ جواب دیا۔ البتہ ان کی تباہی خود ان ہمسایہ ریاستوں کے آپس کے جھگڑوں کے باعث ہوئی۔ اگر یہ ریاستیں ہمیشہ آپس میں متحد رہتیں اور ہر آڑے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتیں تو دکن کی تاریخ موجودہ تاریخ سے مختلف تاریخ ہوتی۔ مغلیہ حکومت نے ان ریاستوں کی باہمی چپقلش سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ اور یہی آپس کی چپقلش ان کے خاتمے کا باعث بنی۔

۱۱ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو خود شاہجہاں نے آگرے سے دکن کا رُخ کیا اور اس نے اپنے حاجب مکرمت خاں کو بیجاپور اور حاجب عبداللطیف کو گولکنڈہ روانہ کیا۔ عبداللطیف کے ساتھ عبداللہ قطب شاہ کے نام ایک شہنشاہی فرمان

بھی تھا۔

جب شاہجہاں کا حاجب عبداللطیف قطب شاہی سلطنت کی سرحد پہ پہنچا تو علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے بھانجے شیخ محمد طاہر سرخیل سلطنت نے سرحد پر حاجب کا پرجوش استقبال کیا۔ اسی طرح دارالحکومت تک پہنچنے تک ہر منزل پر حاجب کا شایانِ شان استقبال ہوتا رہا۔ ہر منزل پر اس کو خوش آمدید کہا جاتا رہا۔ جب حاجب حیدرآباد کے قریب پہنچا اور حسین ساگر تک آگیا تو یہاں اس کا بادشاہ کی طرف سے شاندار استقبال کیا گیا۔ یہ استقبال بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

عبداللطیف نے عبداللہ قطب شاہ کو شاہجہاں کا فرمان پیش کیا۔ یہاں ایک بات خاص طور پہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مغلیہ سلطنت نے قطب شاہوں کو سرے سے بادشاہ تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ ان کی حکومت کو حکومت مانا۔ یہی وجہ تھی کہ شہنشاہی مراسلتوں میں قطب شاہوں کو صرف "قطب الملک" سے مخاطب کیا گیا۔ مغل شہنشاہ کے فرمان کے چند اہم فقرے یہ ہیں:

"قطب الملک .... بداند کہ مابدولت واقبال بادشاہ اسلام و مروج دین حضرت سید انام علیہ والہ .... موید و مروج مذہب اہلسنت وجماعتیم۔ بہرما واجب است کہ دعہرجا کہ حکم اشرف اقدس جاری باشد احکام شریعت غرّہ .... جاری سازیم .. بہ سامع جاہ وجلال رسیدہ کہ در ملک آں قطب الملک .... سب صحابہ کبار .... می نماید وآں ایالت پناہ منع نمی کند ونہ سزائے اعمال نمی رساند۔ بنابرآں از روئے ارشاد حکم می فرمائیم کہ از ملک خویش ایں امر قبیح وفعل شنیع برطرف گرداند اگر بدبختے .. مرتکب شود اورا سیاست نماید واگر چنیں نخواہد کرد .... دریں صورت بریا لازم است کہ در مقام تسخیر آں ملک شویم و مال واہل آں ولایت رابرخود حلال دانیم ۔ ودیگر تعرض کہ خطبہ را در آں

ملک بنام فرمانروائے ایران می خوانند ہرگاہ آں ایالت پناہ دعوی مریدی ما نمودہ باشد با فرمانروائے ایراں چہ رجوع دارد باید کہ بعد ازیں نام فرمانروائے ایران در خطبہ مذکور نہ سازد در آں ملک خطبہ بنام نامی ۔ ۔ ۔ ۔ مازین باشد دیگر مبلغ کل از بابت پیشکش آں ایالت پناہ را باید داد"۔ ؎

ترجمہ: قطب الملک کو ۔ ۔ ۔ معلوم ہو کہ ما بدولت (شاہجہاں) پادشاہ اسلام دین ختمی مرتبت کو جاری کرنے (رواج دینے) والے مؤید مذہب اہلسنت والجماعت ہیں۔ ہر اس مقام پر جہاں ہمارا حکم چلتا ہے احکام شریعت غرہ جاری کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے کانوں تک (یہ بات) پہنچی ہے کہ قطب الملک کے ملک میں ۔ ۔ ۔ سب صحابہ کبار ۔ ۔ ۔ ہوتا ہے اور آپ نہ منع کرتے ہیں اور نہ ان اعمال کی سزا دیتے ہیں ۔ ۔ اس بنا پر ارشاد (نبوی) کی رو سے حکم دیتے ہیں کہ اپنے ملک سے اس امر قبیح اور فعل شنیع کو ختم کریں اگر کوئی بدبخت ۔ ۔ ۔ ۔ مرتکب ہو تو اس کو سزا دی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ۔ ۔ ۔ ۔ اس صورت میں ہم پر لازم ہے کہ ہم اس ملک کی تسخیر کریں ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس ملک اور رعیت کی ہر چیز کو ہم پر حلال سمجھیں ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس ملک میں خطبہ میں فرمانروائے ایران کا نام پڑھا جاتا ہے۔ (حالانکہ) آپ نے ہماری ماتحتی کا دعویٰ کیا تھا۔ نہ کہ فرمانروائے ایران کی ماتحتی کا ۔ ۔ ۔ اس کے بعد آپ کو چاہیئے کہ خطبہ میں ایران کے بادشاہ کا نام نہ لیا جائے۔ اپنے ملک میں خطبہ کو ہمارے نام نامی سے زینت دی جائے نیز بقایاجات ادا کئے جائیں۔

اس فرمان یا دھمکی پر بہرحال گفتگو کے لیے علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے عبداللطیف حاجب کو اپنے دولت کدہ پر مدعو کیا بشہنشاہی معیار اور

قطب شاہی روایات کی پابندی کرتے ہوئے شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ ضیافت سے فارغ ہونے کے بعد گفتگو شروع ہوئی گفتگو کے دوران علامہ نے حاجب کو سمجھایا کہ عبداللہ قطب شاہ اور اس کی حکومت مغلیہ سلطنت کی وفادار رہے اور اس کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس ساری گفتگو میں خطبہ میں صحابہ کے نام داخل کرنا شامل نہیں تھا۔ اصل میں عبداللہ قطب شاہ خطبہ میں تبدیلی کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ کئی دنوں تک گفتگو جاری رہی۔ لیکن اس بات چیت سے کوئی ثمر اور نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ گفت و شنید کم و بیش ناکام ہوگئی۔ کیوں کہ عبداللطیف نے گفتگو کی جو روداد شاہجہاں کو روانہ کیا تھا وہ اس سے مطمئن نہیں تھا۔ بلکہ اس نے سرے سے اس رپورٹ کو بے معنیٰ قرار دیا۔ شاہجہاں اپنے فرمان میں درج کردہ شرائط سے ہٹ کر کسی دوسری صورت کو قبول کرنے آمادہ ہی نہیں تھا۔

علامہ نے دونوں بادشاہوں کے رویوں کو دیکھ کر حالات کو ہموار رکھنے کے لیے ایک اور صورت نکالی۔ انھوں نے علماء کی ایک مجلس منعقد کی۔ علما کے سامنے ساری صورت حال رکھی مسائل کی نزاکت کے سارے پہلو بیان کئے۔ شاہجہاں کا فرمان بھی انھیں سنایا۔ خون خرابہ کے امکانات اس کے نتائج سے بھی واقف کرایا اور ان سے رائے مشورہ کے بعد خواہش کی کہ وہ اجتماعی طور پر عبداللہ قطب شاہ کو موقع کی نزاکت اور اس کے عواقب سے آگاہ کریں اور بادشاہ کو شاہجہاں کے فرمان کو قبول کر لینے پر آمادہ کریں۔

صورتِ حال یہ تھی کہ شاہجہاں کے آگرے سے چلنے کی خبر سن کر عبداللہ قطب شاہ قلعہ کو مضبوط کرنے کی طرف متوجہ ہوگیا اور گولہ بارود بھی ذخیرہ کرنے لگا۔ عبداللطیف یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس عمل کا مطلب بھی سمجھ رہا تھا۔ اس نے شاہجہاں کو لکھا فرمان پر نظرثانی کرے اس نے صورتِ حال سے آگاہ بھی کیا لیکن شاہجہاں نے عبداللطیف کی سفارش کو قبول نہیں کیا وہ اپنی ماج ہٹ پر اڑا رہا اور حکم دیا کہ وہ عبداللہ قطب شاہ سے پھر ملے۔ عبداللہ قطب شاہ نے پھر علامہ

ابن خاتون علیہ الرحمہ ہی کو عبد اللطیف سے گفت گو کے نامزد کیا۔ علامہ نے حاجب کو باغ نبی میں ٹھہرایا اور گفت و شنید کے لیے دولت خانہ عالی پر بلوایا۔ یہاں شاہانہ ضیافت کے بعد بات چیت شروع ہوئی۔ شاہجہاں کی شرط یہ تھی کہ قطب شاہی مملکت میں خطبہ میں صفوی بادشاہ کے نام کی بجائے مغل شہنشاہ کا نام داخل کیا جائے۔ اس موضوع پر گفت گو میں پھر تعطل پیدا ہوگیا کیوں کہ عبداللہ قطب شاہ صفوی بادشاہ کا نام خطبہ سے نکالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے علامہ نے پھر ایک بار ملک کے علماء، دانشور، اکابرین اور عمائدین کو بلوایا۔ مسئلے کو ہر زاویہ سے سوچا گیا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کیا گیا۔ آخر کار اس مجلسِ مشاورت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ کا حل خود علامہ تلاش کریں اور وہ جو بھی فیصلہ کریں گے سب کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ علامہ نے فیصلہ دیا کہ شاہجہاں کی شرطیں قبول کرلی جائیں۔ علماء کا اقدام بارآور ہوا۔ سبھوں نے مان لیا کہ مغل شہنشاہ کی شرطیں مان لی جائیں علماء، اکابرین، عمائدین اور اعیان سلطنت کے اس متفقہ فیصلہ کے بعد خود بادشاہ کے لیے اس فیصلہ کو قبول کرنے کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے بادلِ ناخواستہ سہی شاہجہاں کی شرطیں قبول کرلیں۔ اس طرح کشت و خون کا جو طوفان اُٹھنے والا تھا پرسکون ماحول پر ٹل گیا۔ علامہ کی مساعی اس خصوص میں کافی اہمیت کی حامل رہی۔ علامہ کے مدبرانہ اقدام نے گولکنڈہ کے سر سے ایک ہیجان انگیز بلا کو ٹال دیا۔

عبداللہ قطب شاہ کی دل برداشتگی کی ایک معقول وجہ تھی وہ محض اپنی ذاتی افتاد کی بنا پر ناراض نہیں تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان قلی قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہیہ کے عہد ہی سے اذان میں حضرت علیؑ کا نام اور خطبہ جمعہ میں ائمہ اثنا عشری علیہم السلام کے اسمائے گرامی بعد شہنشاہ ایران کا نام چلا آرہا تھا۔ حکومت کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ یک لخت اس روایت کو توڑنا آسان نہیں تھا شاہان قطب شاہیہ نے شاہان ایران کا نام خطبہ میں جان بوجھ کر رکھا تھا۔ اور وہ وجہ یہ تھی:-

"سلطان قلی (بانی سلطنت قطب شاہیہ) شیعہ تھا۔ اس کے آبا و اجداد بھی اسی مذہب کے پابند تھے۔ اس کو جب تلنگانہ کی حکومت مل گئی تو اپنے علاقہ میں مذہب شیعہ کی اشاعت شروع کی اور گولکنڈہ کی جامع مسجد میں ائمہ اثنا عشری علیہم السلام کے نام سے خطبہ پڑھوایا۔ شاہ اسماعیل صفوی کو وہ اپنا مرشد زادہ سمجھتا تھا اسی لیے اس کا نام اپنے نام سے پہلے خطبہ میں داخل کیا۔"[۲۱]

اسی طرح اس کا بیٹا ابراہیم قطب شاہ بھی اسی عقیدہ پر قائم تھا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ سلاطین صفویہ "امام غایبؑ" کے نایب ہیں اور وہ خود ان کا ایک عامل ہے اس لیے اس نے بھی خطبہ میں ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے اسمائے گرامی کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کا نام خطبہ میں شامل رکھا۔[۲۲] یہ سلسلہ قطب شاہوں میں برقرار تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے لیے اس سلسلہ کو توڑنا بہت شاق تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ اس شاہی روایت کو روک دینا ناگزیر ہوگیا تھا۔

الغرض جب عبداللطیف گولکنڈہ سے چلا تو حیات بخش بیگم نے اپنی بسائی ہوئی بستی حیات آباد میں حاجب کی شاندار ضیافت کی اور شاہجہاں کے لیے قیمتی تحفے روانہ کیئے۔ حاجب کی یہ وداعی تقریب یادگار تقریب تھی۔ ملکہ نے حاجب کو بھی قیمتی تحایف دیئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ شاہجہاں آگرے سے نکل چکا تھا اس عرصہ میں مغل افواج بیجاپور پہنچ گئی اور یوسف عادل شاہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے بعد مغل فوجیں دکن ہی میں پھیل گئیں۔ اسی زمانے میں عبداللطیف عبداللہ قطب شاہ کا انقیاد نامہ لے کر شاہجہاں کی خدمت میں روانہ ہوگیا تھا۔ اس حاجب کے ساتھ شیخ محمد طاہر سرخیل مملکت قطب شاہیہ تھا۔ شاہجہاں اس انقیاد نامہ سے مطمئن ہوگیا اور اس نے عبداللہ قطب شاہ کو دوستی کا عہدنامہ بھی روانہ کردیا۔ شیخ محمد طاہر سرخیل کو دربار میں اعزاز سے نوازا اور ساتھ ہی علامہ ابن خاتون کی مساعی سے خوش ہوکر شہنشاہ نے ان کے لیے خلعت خوشنودی روانہ کیا۔ علامہ کے لیے

یہ بھی بڑے مرتبہ کی بات تھی۔

عبداللہ قطب شاہ نے دیسے نیم رضامندی سے انقیاد نامہ پر زعفران کی روشنائی سے انگوٹھا کر دیا تھا [۲۳] لیکن بہرحال بعد کے حالات سے اس کی کبیدہ خاطری دُور ہو گئی۔ بادشاہ نے علاّمہ کے اعزاز میں اور اضافہ کیا اور داد محل کے اندر صدر محل تک پالکی میں آنے کی اجازت دی۔ یہ اعزاز یا تو حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کو ملے تھے یا پھر انہی کے شاگرد علاّمہ ابن خاتون کو ملے۔

شیخ محمد طاہر مغلیہ سلطنت کے سفیر خواجہ زاہد کے ہمراہ گولکنڈہ لوٹا۔ حسین ساگر پر مغل سفیر کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور اس کے اعزاز میں شاندار دعوت دی گئی۔ علاّمہ نے بھی خواجہ زاہد کی دعوت کی۔ جب کچھ دن کے قیام کے بعد یہ سفیر واپس ہونے لگا تو بادشاہ نے اس کو چار ہزار (۴۰۰۰) ہُن (تقریباً ۳ لاکھ روپے) عطا کئے اور شاہجہاں کو تحفتاً چند زنجیر فیل جن کے دانت بہت بڑے تھے اور ایک الماس جس کا وزن (۶۰) رتی تھا روانہ کیا اس وقت خواجہ زاہد کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف سے مرزا محمد جوہری تھا۔

انقیاد نامے کے بعد دونوں حکومتوں میں سفرا کے تبادلے ہوتے رہے شاہجہاں کے رویہ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ عبداللہ قطب شاہ کے ساتھ اس کا سلوک ایک طرح سے مربیانہ ہو گیا تھا۔

علاّمہ پچھلے چند برسوں کی ملک کی خارجی سیاست سے فارغ ہو کر جبکہ ہر طرح کی آسودگی ہو گئی تھی ایک بار داخلی سیاسی سُدھار کی طرف متوجہ ہوئے مختلف ذمہ دار عہدوں پر فائز موجودہ عہدہ داروں میں مناسب تبدیلیاں کیں مثلاً حکیم عبدالجبار کو عاشور کی روضہ خوانی پر بحال رکھا۔ معزول وزیر یزدی سلطان کی خطاؤں کو بادشاہ سے معاف کروا کر وزیر فوج مقرر کیا۔ اور مرتضیٰ نگر اور معدن الماس کی نگرانی اس کے سپرد کی۔ اور بعض عہدے موزوں لوگوں کو دیئے۔

سنہ ۱۰۴۷ھ کو ایک ناگوار واقعہ رونما ہوا۔ دکن کے ایک وزیر شجاع الملک کا محل عادل شاہی حکومت کے سفیر شاہ ابوالحسن کے محل کے قریب تھا۔ شجاع الملک

کے ایک سپاہی نے یونہی بندوق چلائی۔ بندوق کی گولی اتفاقاً شاہ ابوالحسن کے محل میں گری[۲۴]۔ سفیر اس پر برہم ہوگیا۔ ابوالحسن کے آدمیوں نے شجاع الملک کے سپاہی کو گرفتار کرلیا اور اپنے محل میں لے گئے۔ جب شجاع الملک کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ برہم ہوگئے اور ان کے سپاہیوں نے شاہ ابوالحسن کے محل پہ حملہ بول دیا اور محل کے دروازے کو آگ لگادی۔ اس کی اطلاع علامہ کو ہوئی تو انھوں نے اس واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا اور سرکاری سطح پر معذرت کی[۲۵]۔ سفیر پر سرکاری معذرت کا اثر نہیں ہوا اس نے عادل شاہ کو شکایتی خط بھیج دیا۔ جب علامہ کو یہ بات معلوم ہوا کہ شاہ ابوالحسن نے حکومت کی معذرت کو قبول نہیں کیا ہے اور شکایتی خط عادل شاہ کو بھیج دیا ہے تو اُنھوں نے اب سفیر سے کوئی بات نہیں کی بلکہ افضل الفضلا قاضی احسن کو تحفوں کے ساتھ عادل شاہ کی خدمت میں روانہ کردیا۔ قاضی احسن نے بڑی حسن وخوبی کے ساتھ عادل شاہ کو حقیقی صورتِ حال سے واقف کرایا۔ عادل شاہ نے شاہ ابوالحسن کو اس کے اس عمل پر ڈانٹا اور کافی سرزنش کی یہی نہیں بلکہ اس کو عہدہ سے بھی معزول کردیا اور اس کی جگہ میر حسین اصفہانی کا تقرر کردیا۔ اور قاضی احسن کے ہمراہ گولکنڈہ روانہ کیا۔ ابوالحسن کو بیجاپور واپس ہوجانا پڑا[۲۶]۔

۱۰۴۹ھ میں گولکنڈے سے بیجاپور کی حکومت میں سفیر بھیجنے کا مسئلہ اہم ہوگیا تھا علامہ کے مشورے اور سفارش پر افضل العلماء قاضی احسن کو بیجاپور کے لیے سفیر مقرر کیا گیا اسی سال دو زبردست علماء مرزا ابوالقاسم اور مرزا عباس گیلانی گولکنڈہ آئے۔ یہ دونوں بزرگ شخصیتیں شاہجہاں کے دربار میں رہ چکی تھیں۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی وساطت سے عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے ان کے رُتبہ کے لحاظ سے انعام دیا گیا اور وظیفہ مقرر ہوا۔ اور حکم ہوا کہ وہ گولکنڈے میں علم منطق، ریاضی اور دوسرے علوم کی تعلیم دیا کریں۔

علامہ کے خطابات:۔ عبداللہ قطب شاہ علامہ کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ علامہ کے کارناموں سے بہت خوش تھا ہر مناسب اور موزوں موقع پر شاہی الطاف وعنایات سے نوازتا رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ خطابات سے بھی سرفراز کرتا تھا۔

علّامہ کے خطابات تقریباً وہی تھے جو حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کے تھے علّامہ کے خطابات تھے تذدۃ الدورانی، لقمان الزمانی، علامی فہامی، جملۃ الملک پیشوائے زمانی اور نواب مستطاب کو تاریخ نے محفوظ کئے ہیں۔[۲۶]

علّامہ علیہ الرحمہ ان کے اعلیٰ کارناموں پر حکومت نے جاگیریں بھی عطا کی ہوں گی جس طرح حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کو دی گئی تھیں لیکن سقوط حیدرآباد کے وقت حیدرآباد پر کچھ ایسا برا وقت آگیا تھا کہ اس کا سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ اس تباہی نے اس سرمایہ کو بھی برباد کر دیا جس کی مدد سے اس کی خوبصورت تاریخ کے بہت سے روشن پہلو سامنے آتے جن سے یہاں کی تہذیب پر زیادہ روشنی پڑتی۔

اِس تباہی سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ سارے دفتری ریکارڈ ختم ہو گئے اب جو کچھ ریکارڈ دستیاب ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ علّامہ کے تعلق سے شاہی فرامین اور احکامات جو وقتاً فوقتاً نکلے ہوں گے ان میں سے کچھ بھی ہمارے دسترس میں نہیں ہے دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ علّامہ کے اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ بیوی کا بھی ان کے حینِ حیات انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۰۵۸/۵۹ھ میں حج کو روانہ ہونے سے پہلے علّامہ نے اپنا سارا اثاثہ ایران بھیج دیا اور اپنے ورثا میں تقسیم کروا دیا۔ ہو سکتا ہے علّامہ کے جاگیر وغیرہ کے اسناد اسی سامان کے ساتھ ایران چلے گئے ہوں یہی وجہ ہے کہ علّامہ کی زندگی کا یہ پہلو اندھیرے میں ہے۔ علّامہ کی تنخواہ کا مواد بھی نہیں ملتا۔ لیکن چونکہ حضرت میر محمّد مومن کی تنخواہ کو دیکھتے ہوئے ہم پیشوا کی تنخواہ معلوم کر سکتے ہیں علاوہ علّامہ کے دولت کدہ پر دو مرتبہ عبداللہ قطب شاہ اور اس کی ماں حیات بخشی بیگم کا مہمان ہونا بھی ظاہر کرتا ہے کہ علّامہ کا معاشی موقف اونچے درجہ کے جاگیرداروں سے بھی اُونچا رہا ہوگا۔

علّامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے حکومت کے استحکام کے لیے زندگی بھر کوشش کی اور اسی طرح نشر و اشاعت علوم کے لیے بھی زندگی بھر کوشاں رہے قابل شخصیتوں کو گولکنڈہ میں جمع کیا جیسا کہ ابھی ہم نے دیکھا کہ مرزا ابوالقاسم اور مرزا عباس گیلانی کو علم ریاضی منطق اور دیگر علوم معقول کو پڑھانے کے لیے

مقرر کیا۔ پڑھے لکھے اور قابل شخصیتوں کی زندگی کی مثالوں نے یہاں کی تہذیب میں سنجیدگی، متانت اور بُردباری پیدا کی اور تمدن کے معیار کو بلند کیا۔

علّامہ کا عزمِ حج

علامہ سلطنتِ قطب شاہیہ کی تقریباً چالیس سال خدمت کی جیسا کہ خود علّامہ کی منظوم درخواست رخصت برائے حج سے ظاہر ہے۔

قرب چل سالست کایں درگاہ را بوسیدہ ام
کردہ در روزی دو نوبت دیدہ بانت عرضِ مدعا

ترجمہ: چالیس کے قریب میں (علّامہ) نے اس بارگاہ کی آستاں بوسی کی ہے اور ہر روز دو بار درباں بارگاہ سے عرض کیا ہے درخواست پیش خدمت ہو۔

علّامہ ملازمت کے دوران حکومت کے بلند ترین عہدوں پر فائز رہے مشیرِ سلطنت کے عہدہ سے ملازمت شروع ہوئی سفیر ایران بنے۔ نائب پیشوا بنائے گئے اس کے بعد پیشوائے سلطنت پر تقرر ہوا۔ درمیان میں ہلکا سا تعطل پیدا ہوا۔ پیشوائی سے ہٹائے گئے لیکن پھر تین چار مہینہ کے اندر ہی یہ تعطل دور ہوگیا بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا علّامہ کو دربار میں عزت سے بلوایا میر جملگی کی خدمت پیش کی اسی کے ساتھ ایسے اعزاز سے نوازا جس نے پیشوائی کے مرتبہ سے بھی علّامہ کو بلند کر دیا۔ بادشاہ "مجلس خاص" کے برخاست ہونے کے بعد بھی صرف علّامہ ہی سے وقت عصر تک بلکہ شام اور بعض مرتبہ رات کے ایک حصّہ تک مشاورت میں مصروف رہتا تھا۔ اور باقی وقت علّامہ کے ساتھ گزارتا تھا۔

"بعد از فراغ از مجلس خاص کہ حضرات مرخص می گردیدند تا وقت عصر بلکہ تا شام و پارہ شب بصحبت علامی اوقات اشرف می گذرانید۔"[۲۷]

ترجمہ: (بادشاہ) مجلس خاص کے ختم ہوجانے اور سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی عصر تک بلکہ شام اور رات کے ایک خاص حصّہ تک علّامہ کی صحبت میں گزارتا تھا۔

بہت جلد علّامہ ابن خاتون اپنے منصب پیشوائی پر واپس آگئے اور آخر عمر تک

اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔

۱۰۵۸ھ میں علامہ نے عبداللہ قطب شاہ سے اپنے حج کرنے کے ارادہ کو بیان کیا اور ایک منظوم عرضداشت بھی پیش کی، عبداللہ قطب شاہ کو چھوڑ میں پس و پیش تو ہوا لیکن بات واجبات کی ادائیگی کی تھی حج ہر مستطیع پر واجب ہے بادشاہ نے اجازت دے دی۔

"در اواخر حال بہ تائید ایزد مشعال جذبۂ شوق حج بیت اللہ و زیارت مقدسہ سید انام علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام غالب و جالب گشتہ ۔۔۔۔۔
در باب رخصت حج قصیدۂ زبدہ در سلک نظم۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ عرض رسانید۔۔۔۔ کہ چند بیت ازاں جہت در سلک بیان انتظام داد۔۔۔۔۔

(۱) قرب چل سالست کایں درگاہ راہ بوسیدہ ام
کردہ در روزی دو نوبت دیدہ بانت عرضداشت

(۲) التماس رخصت حج ست ولشگفت از کمند
معشر جیل ملک از آسمانت عرضداشت

(۳) عزم درگاہ کسی دارم کہ محتاجی بہ او
رخصتم دہ تا نمایم از زبانت عرضداشت"[۲۸]

ترجمہ:- پروردگار عالم کی تائید تھی کہ آخری دورِ حیات میں حج و زیارت کا شوق شدید ہوا۔ حج کے لیے رخصت کی درخواست نہایت [مرصع] و بے مثال قصیدہ کی صورت میں [بادشاہ کی خدمت میں] پیش کی۔ جس کے چند اشعار سے یہاں [میں نے] اپنے بیان کو زینت دی ہے۔

(۱)۔ اس بارگاہ کی داستان بوسی کو قریب چالیس ہو گئے ہر روز دوبار کے دربان سے عرض کیا ہے کہ درخواست پیش ہو۔

(۲) وہ رسی کھل گئی ہے حج کے لیے رخصت کا معروضہ ہے۔ آپ کے

آسماں سے فرشتوں ایک گردہ کی عرض داشت ہے۔

(۳) مَیں نے ایسے کی بارگاہ پر حاضری دینے کا عزم کیا ہے جس کا ہر کوئی محتاج ہے (ادباً) عرض ہے کہ میری رخصت منظور ہو۔

عبداللہ قطب شاہ سے علاّمہ نے اجازت حاصل کر لی اور سفر حج کیلئے تیار ہو گئے جب چلنے لگے تو بادشاہ اور ملکہ حیات بخش بیگم نے سفر حج کے طور پر بہت کچھ نوازشیں کیں علاّمہ ۱۰۵۹ھ کے کسی مہینہ میں حج کے لیے روانہ ہوئے یہ علاّمہ کا دوسرا حج تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ۱۰۵۸ھ بھی حج کے لیے روانگی کا سنہ بتایا ہے وہ صحیح نہیں ہے صاحب مآثر قطب شاہیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعہ سے علاّمہ کی حج کے لیے روانگی کے سنہ کا پتہ چلتا ہے!

"ایک روز سرمد کی صحبت میں مصنف دبستان حاضر تھا۔ اور "حیران" نام کا ایک شخص ابن خاتون کی مدح کر رہا تھا اس موقع پر سرمد نے کہا کہ شیخ عنقریب سفر آخرت کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ اسی سال شیخ ابن خاتون حج و زیارت کے لیے روانہ ہوئے لاستہ میں بمقام "مخا" ۱۰۵۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔"[۲۹]

علاّمہ کی وفات

مندرجہ بالا عبارت سے علاّمہ کا ۱۰۵۹ھ میں حج کے لیے حیدرآباد سے روانہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علاّمہ بندرگاہ "مخا" پر پہنچے (مخا سواحل عرب کی بندرگاہوں میں سے ایک بندرگاہ ہے) جہاز سے اُترنے کے بعد علاّمہ کی طبیعت خراب ہوئی کیونکہ نازک مزاجی اطراف کے تعفن کو برداشت نہ کر سکی۔ بیمار ہو گئے اور انتقال کیا۔

مجملاً جناب شیخ رفیع مقام بجد و جہد تمام رخصت از پیشگاہ سلطنت حاصل نمودہ بعزت و احترام۔ ۔ ۔ ۔ از جانب اعالی حضرت خاقانی و چہ از طرف حضرت مریم مکانی سرفراز و ممتاز گشتہ۔ ۔ ۔ ۔ چوں از دریا عبور کردہ بہ بندر مخا رسید۔ وجود نازکش کہ مانند گل تازہ

بود از تعفن دریا پژمردہ گشتہ پہلو بر بستر ناتوانی گذاشت در شہور سنہ تسع و خمسین والف داعی حق را لبیک اجابت گفتہ بطواف روضہ رضوان شتافت. ۳۰ھ

ترجمہ: مختصر یہ کہ علامہ نے بڑی جدوجہد کے بعد بادشاہ سے رخصت حاصل کی۔ بادشاہ اور ملکہ (حیات بخش بیگم) نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ اپنی سرفرازیوں سے (علامہ) کو ممتاز کیا۔ ... جب دریا کو پار کر کے بندر 'مخا' پر پہنچے گل تازہ کی طرح نازک بدن دریا کے تعفن سے پژمردہ ہوگیا۔ اور فریش ہو گئے ۱۰۵۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور باغ جنت کی طرف روانہ ہوگئے۔

محمد رضا النحوی نے تاریخ وفات کہی ہے۔

سال تاریخ شیخ می جستم ؛ گفت ہاتف کہ حج شیخ قبول ۱۰۵۹ھ

ترجمہ: شیخ (علامہ) کی تاریخ (وفات) میں نے ڈھونڈلی ہاتف نے ندا دی کہ "حج شیخ قبول" ۱۰۵۹ھ

صاحب دبستان ذوالفقار بن آذر ساسانی لکھتا ہے۔

درہمیں سال شیخ بعزم حج از حیدرآباد رواں شدہ در ہزار پنجاہ و نہ در بندر 'مخا' دانش از سفینۂ تن بمحط اطلاق پیوست ۳۱ھ

ترجمہ: اسی سال علامہ حیدرآباد سے بعزم حج روانہ ہوئے اور بندر مخا پہ انتقال فرمایا۔

مرزا طاہر نصرآبادی کا کہنا ہے کہ:

مدتی قبل ازیں بہ ہندوستان رفتہ بخدمت عبداللہ قطب شاہ کمال اعتبار بہم رسانیدہ درانجا فوت شد ... دیانت شعار مرزا اسد را وصی کردہ جمیع اسباب خود را یاد داد کہ در ایران بودنہ او بر ساند ہمہ را بلا قصور بورثہ رسانید و شاہد بسیار دارد یکی از انجملہ فقیرم. ۳۲ھ

ترجمہ: .... اس سے کچھ دن پہلے (علامہ) ہندوستان پہنچے اور عبداللہ قطب شاہ

کے معتمدین میں شامل ہو گئے۔ وہیں انتقال کیا۔ دیانت شعار . . . .
مرزا اسد کو اپنا تمام اسباب دے کر ایران میں اپنے ورثا کے حوالے
کرنے پر مقرر کیا (ان کی وصیت کے مطابق) سامان کو (دیانتا
کے ساتھ) پہنچا دیا گیا۔ اس کے کئی گواہ ہیں جن میں فقیر بھی شامل ہے

ڈاکٹر اطہر عباس تحریر فرماتے ہیں:

انھوں نے (علامہ ابن خاتون) مکہ کے راستہ پر بمقام مخا انتقال
فرمایا ان کی (سونی ہوئی) لاش حیدرآباد لائی گئی اور ان کی بیوی کے
پہلو میں دفن کی گئی۔[۳۳]

ماہر آثارِ قدیمہ سید علی اصغر بلگرامی نے لکھا ہے کہ:

علامہ شیخ محمد بن علی بن خاتون الطوسی و العاملی الشہیر بہ ابن خاتون
. . . . پرانی حویلی کی دیوار کے اندر محاذی دیوڑھی تدبیر جنگ بہادر
آپ مع اپنی بیوی کے آسودہ ہیں۔[۳۴]

ڈاکٹر نجمہ صدیقہ نے اپنے مقالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

کشکول [۱۶] سالار جنگ میوزیم لائبریری میں ایک مخطوط ہے۔ اس
میں علامہ کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ وہ ہے شنبہ ۵ جمادی الاول
سنہ ۱۰۵۹ھ م ۱۹ جنوری سنہ ۱۶۴۰ء[۳۵]

قدیم تذکروں میں تضاد بیانیوں کی روایت عام ہے۔ ایک تذکرہ نویس کا
بیان دوسرے سے نہیں ملتا ہے۔ تضادات کے ازدہام تحقیق کرنے والے طالب علم
کو بڑی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ ملا طاہر استر آبادی، سید علی اصغر بلگرامی اور
دورِ حاضر کے مستند محقق و مورخ ڈاکٹر سید اطہر عباس اس پر متفق ہیں کہ علامہ حیدرآباد
میں اپنی بیوی کے پہلو میں مدفون ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر صاحب مآثر دکن نے لکھا
ہے کہ علامہ کے مزار پر

"شہر کے خوش عقیدہ اشخاص پنجشنبہ کو فاتحہ خوانی کے لیے آیا
کرتے ہیں۔"[۳۶]

عقیدت مندوں کا ہجوم اور مُرادوں کا پورا ہونا۔ اور دوسرے بہت سے قرینے جیسے بزرگوں سے علّامہ کا مزار ہونے کی خبر کا مسلسل ہونا وہ ثبوت ہیں جن سے یقین کرنے میں کوئی احتمال نہیں رہتا کہ علّامہ حیدرآبادی ہیں آسودہ خاک ہیں گمنام مولف کشکول (ع ۱۶ سالار جنگ لائبریری) کا تاریخ وفات اور دن تک کا ذکر کر دینا بھی یہی اشارہ کرتا ہے۔

غالبًا علّامہ اپنے مزار پر چھت کا ہونا پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ علّامہ کی قبر پر چھت نہیں ہے بلکہ پتھر کی سلیں رکھی ہوئی ہیں جن پر ایک بیل سایہ فگن ہے یہ بیل بھی بہت پُرانی ہے کیوں کہ اس بیل کا ذکر ہمارے اجداد نے بھی کیا ہے۔ اس کی عمر بھی صدیوں کی ہے۔ میں بھی بچپن سے اس بیل کو ایک ہی حالت میں دیکھتا چلا آرہا ہوں۔

آج کل علّامہ کے مزار پر عقیدت مندوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا ہے۔ میں اپنے بچپن ہی سے علّامہ کے مزار کی زیارت کرتا چلا آرہا ہوں۔ پچھلے دنوں یعنی میری جوانی کے زمانہ میں صرف جمعرات ہی کو علّامہ کے مزار پر لوگوں کی کثرت دکھائی دیتی تھی لیکن آج کل ہر روز جیسے یوم پنجشنبہ بنا ہوا ہے۔ لوگ کثرت سے مزار پر پھول چڑھاتے ہیں علّامہ کا مزار آج کل مرجع خلائق بن گیا ہے۔ مرادیں پانے والوں نے یہاں برقی روشنی کا بھی انتظام کردیا ہے۔ آج کل ایک چبوترہ بھی درگاہ کے متصل بنا دیا گیا ہے یہ سب عقیدت مندوں کی طرف سے ہے۔ علّامہ کے مزار کا کوئی متولی نہیں ہے۔ مزار وقف بورڈ کی نگرانی میں ہے۔ اس مزار کی حفاظت قطب شاہوں کے ایک دور کی حفاظت کے مترادف ہے۔

باب (۳) حوالے

(۱)	عبدالمجید صدیقی	تاریخ گولکنڈہ	۱۷۵ صفحہ
(۲)	"	"	۱۸۶ صفحہ
(۳)	نظام الدین	حدیقۃ السلاطین	۷۷ صفحہ

(۴) اختر حسن — قطب شاہی دور میں فارسی ادب — ص ۱۳۴

(۵) عبدالمجید صدیقی — تاریخ گولکنڈہ — ص ۱۸۷

(۶) حکیم شمس اللہ قادری — مآثر قطب شاہیہ — ص ۶۲، ص ۶۱

(۷) نظام الدین صاعدی — حدیقۃ السلاطین — ص ــــ

(۸) فنِ خطاطی کی اصطلاح ہے۔ ہفت قلم (سات قلم) اُس ماہرِ خطاط کو کہا جاتا ہے جو فنِ خطاطی کے مختلف قسم کے خط جیسے نسخ، ثلث، ریحان، غبار، بہار نستعلیق وغیرہ پر عبور رکھتا ہو۔

(۹) نظام الدین — حدیقۃ السلاطین — ص ۹۸، ۹۷

(۱۰) ہُن یا "ہون" قطب شاہی سونے کا سکہ تھا جس کی قیمت عہدِ عثمانی میں ۴ روپیہ تھی لیکن آج کل روپیہ کی قدر بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے اس سکے کی قیمت کم و بیش (۸۰) روپے ہوتی ہے۔

(۱۱) نظام الدین — حدیقۃ السلاطین — ص ۱۰۲ — مرتبہ علی اصغر بلگرامی

(۱۲) 〃 — 〃 — ص ۱۰۳ — 〃

(۱۳) 〃 — 〃 — ص ۱۰۴ — 〃

(۱۴) 〃 — 〃 — ص ۱۰۹ — 〃

(۱۵) 〃 — 〃 — ص ۱۴۵ — 〃

(۱۶) 〃 — 〃 — ص ۱۴۷ — 〃

(۱۷) 〃 — 〃 — ص ۱۴۸ — 〃

(۱۸) حکیم نظام الدین گیلانی علمِ معقول و منقول کے جیّد عالم تھے۔ شیخ بہاالدین عاملی کے شاگرد تھے۔ شمس الدین محمد باقر داماد سے علمِ حکمت و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شاہجہاں کے سپہ سالار مہابت خان سے متوسل تھے۔ مہابت خان کے ساتھ دکن آئے تھے۔ سنہ ۱۰۴۴ھ میں مہابت کا دکن میں انتقال ہو گیا۔ نظام الدین ایران واپس ہونا چاہتے تھے۔ علامہ کو اور عبداللہ قطب شاہ کو خبر ہوئی کہ انہوں نے گولکنڈہ بلا لیا طبیب شاہی کے عہدے پر تقرر کیا۔ نظام الدین نے دکن میں (۲۷)

سال گزارے وہ حکومت کے وفاداروں میں سے تھے۔

نمبر	نام	ماخذ	صفحہ	کیفیت
(۱۹)	نظام الدین	حدیقۃ السلاطین	ص ۱۹۴	مرتبہ علی اصغر بلگرامی
(۲۰)	عبدالمجید صدیقی	تاریخ گولکنڈہ	ص ۲۸، ۴۲۷	ادبیات اردو
(۲۱)	حکیم شمس اللہ قادری	آثر قطب شاہیہ	ص ۱۳	
(۲۲)	”		ص ۱۷	
(۲۳)	عبدالمجید	تاریخ گولکنڈہ	ص ۲۹، ص ۴۲۸	
(۲۴)	نظام الدین	حدیقۃ السلاطین	ص ۱۷۱	مرتبہ ادبیات اردو
(۲۵)	”	”	ص ۱۹۴	
(۲۶)	حکیم شمس اللہ قادری	رسالہ تاریخ		
(۲۷)	نظام الدین	حدیقۃ السلاطین ج ۱	ص ۱۲۶	مرتبہ ادبیات اردو
(۲۸)	علی بن طیفور	حدائق السلاطین	ص	مرتبہ ڈاکٹر شریف النساء
(۲۹)	حکیم شمس اللہ قادری	آثر قطب شاہیہ	ص ۱۰۰، ۹۹	
(۳۰)	علی بن طیفور	حدائق السلاطین	ص	مرتبہ ڈاکٹر شریف النساءؑ
(۳۱)	ذوالفقار اذد	دبستان	ص ۲۰۴	
(۳۲)	طاہر نصر آبادی	تذکرہ الشعراء	ص ۶۰، ۱۵۹	
(۳۳)	ڈاکٹر اطہر عباس	تاریخ شیعت ہندوستان میں انگریزی	ص ۳۲۶	
(۳۴)	سید علی اصغر بلگرامی	آثر دکن	ص ۴۲	
(۳۵)	ڈاکٹر نجمہ صدیقہ	عہد قطب شاہی میں فارسی زبان و ادب (انگریزی)	ص ۴۴، ۵۴۳	غیر مطبوعہ
(۳۶)	علی اصغر بلگرامی	آثر دکن	ص ۴۲	

باب (۴)

علاّمہ کی نجی اور نیم سرکاری مصروفیات

علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے بڑی مصروف زندگی گزاری۔ صاحب مآثر قطب شاہیہ نے لکھا ہے کہ:

"علاّمہ ابن خاتون مہام سلطنت اور اُمور مملکت کی کثرت، دو وقتہ بارگاہِ سُلطانی کی حاضری کے باوجود روزانہ علی الصبح اپنے دولت خانہ پر مجلس درس منعقد کرتے تھے۔ اس مجلس میں شہر کے قضاۃ، علما، فضلا، صلحا، شعرا، اُمرا اور دیگر اعیان و اکابر شریک ہوتے علم منقول سے تفسیر، حدیث و فقہ کا اور علوم معقول سے فلسفہ، ریاضی و منطق کا درس ہوا کرتا تھا۔ شب میں سفرۂ عام کے بعد ارباب فضل و کمال جمع ہوتے اور مسائلِ علمی پر بحث مباحثے ہوا کرتے تھے۔ سہ شنبہ کو شہر میں تعطیل ہوتی تھی۔ اس روز شعر و سخن کی محفل برپا ہوتی۔ شعرا جمع ہوتے۔ عرب و عجم کے شعرائے متقدمین سے متنبی، خاقانی، انوری، سنائی، اور مولانا روم کے دواوین اور ان کے کُتبِ شروح کا درس دیا کرتے تھے۔ مہینہ میں دو تین مرتبہ بیرون شہر پر فضا باغات میں علاّمہ ابن خاتون جشن زرگانہ قائم کیا کرتے تھے۔ اور اس میں ایران و ہندوستان کے حُجّاب و سفراء کی دعوت ہوا کرتی تھی۔" [۱]

علاّمہ کو درس و تدریس تعلیم و تعلّم سے عشق تھا۔ وہ بنیادی طور پر کامیاب

مدرس تھے ان کا ذوق علمی فطری تھا۔ علامہ نے زندگی کا آغاز ہی درس و تدریس سے کیا تھا۔ علامہ نے گولکنڈہ آنے کے بعد مدرسہ کھول لیا تھا اور علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ علامہ کو حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی سرپرستی حاصل تھی کیوں کر وہ علامہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔

"زیر سرپرستی او (حضرت میر محمد مومن) مدرسہ برپا کردہ بھوارہ درکارہائے علمی و ادبی مشغول شدہ میر محمد مومن ہم علامہ عزیز داشتہ[۲]"

ترجمہ: (حضرت میر مومن) کی سرپرستی میں (انہوں نے) مدرسہ قائم کیا اور علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے (حضرت) میر محمد مومن بھی ان (علامہ) کو عزیز رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ڈدورکا یہ قیاس کہ "کوئی تعجب اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ اگر انھوں (میر محمد مومن علیہ الرحمہ اور علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ) نے علم کی توسیع و تبلیغ کے لیے مذہب و ادب کی مختلف درسگاہیں یا ادارے قائم کئے ہوں" دراصل حقیقت ہے جیسا کہ مندرجہ بالا حوالے سے ثابت ہے۔

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے حکومت کے بلند ترین منصب پر فائز ہونے کے باوجود علمی مجاہدات سے اپنی گہری محبت کو ٹوٹنے نہیں دیا علم منقول و معقول ہمیشہ ان سے جڑا رہا طلبا آتے رہے اس علم کے سمندر سے اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہے بلکہ سیراب ہو کر نکلتے رہے پھیلتے رہے اور سرزمین دکن پر علم و دانش کے چراغ روشن کرتے اور فکر و فن کا اجالا پھیلاتے رہے۔ علامہ علوم کی نشر و اشاعت کے مسئلہ میں بہت شدید تھے۔ ایک پیشوائے سلطنت کا عام مدرسوں میں جا کر شخصی طور پر معائنہ کرنا اور ساتھ ہی اساتذہ کو ہدایات بھی دینا علامہ علم کو عام کرنے کے شدید جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور دلیل بھی بنتے ہیں اس حقیقت کا دوسرا مضبوط ثبوت یہ ہے کہ علامہ نے جگہ جگہ مدارس قائم کئے اور مدرسین کے تقررات کئے۔

شیخ محمد ابن خاتون از علمائے زماں بود دران زمان . . . . . .

مدارس عالی بنا نمود مدرسین آن مدارس مقرر فرمودند۔[۳]

ترجمہ: شیخ ابن خاتون عالم زمانہ تھے انہوں نے مدارس قائم کئے اور مدرسین کا تقرر کیا۔

عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں کہ

"سلطان عبداللہ قطب شاہ کی والدہ حیات النسا عرف حیات بخش نے ابراہیم پٹن کے قریب ایک گاؤں اپنے نام سے آباد کیا۔ اس کا نام حیات نگر رکھا اس میں ایک مسجد عالیشان تعمیر کرائی مسجد کے احاطہ میں طلباء و اساتذہ و ملازمین کے لیے کشادہ حجرے بنوائے ... طلباء و اساتذہ و امام و موذن کے لیے مشاہرات مقرر کئے۔ یہ مدرسہ ملا ابن خاتون میر جملہ کی نگرانی میں تھا مدرسہ میں طلبا اکثر غربا زادے تھے میر جملہ ہفتہ عشرہ کے بعد بطریق سیر و تفریح وہاں جاتا تھا طلباء کی تعلیم کی بابت مدرسین کو ہدایت دیا کرتا تھا۔"[۴]

صاحب محبوب الوطن نے "بطریق سیر و تفریح" لکھ کر اچانک معائنہ کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے۔ تعلیمی اِدارے ہوں کہ عام دفاتر اگر معائنہ کنندہ کے آنے کی خبر قبل از قبل ان اِداروں کو ہو جائے تو پہلے ہی سے ایسا ماحول پیدا کر لیا جاتا ہے جس کے دیکھنے کے بعد حقیقی صورتِ حال سے صحیح آگاہی ممکن نہیں رہتی۔ صحیح اور دُرست طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ معائنہ بلا اِطلاع اور اچانک ہو تاکہ ادارے کی کارکردگی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جا سکے۔ علامہ کی تفریح مقصدی ہوا کرتی تھی۔ اسی مولف نے آگے چل کر ایک دوسری درسگاہ کا ذکر اس طرح کیا ہے

"ملا ابن خاتون میر جملہ نے عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے لنگر فیض ..... کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ مدرسہ کے احاطہ میں طلباء کی سکونت کے لیے متعدد حجرے بنائے گئے تھے اس مدرسہ کے لیے ایک ہزار "ہون" کی جاگیر وقف کر دی گئی تھی۔ جاگیر کا محاصل مدرسہ کی ضروریات پر صرف کیا جاتا تھا۔[۵]

یہاں یہ بات کہ لنگر فیض کے مدرسہ کا قیام عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے ہوا تھا درست تو ہے مگر اس درسگاہ کو علاّمہ ابن خاتون کی فکر اور منصوبہ کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیئے۔ کیوں کہ تعلیم کو عام کرنے کے لیے وہ بہت کوشاں رہتے تھے۔ مدارس کا قیام توانائی رفتار سے ہوتا ہی رہتا تھا۔ لیکن علاّمہ نے خود اپنے دولت کدہ کو بھی مرکز علم بنا رکھا تھا جہاں دن رات تشنگانِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔

کثیر از طلبہ ہر روز و شب مجلس درس او (علاّمہ) رسیدہ بود [۶]

ترجمہ: طلباء کی کثیر تعداد دن رات اِن کی محفلِ درس میں رہا کرتی تھی۔

علاّمہ کی مصروفیت کو جب ان کی سوانح کی سیر کرنے والا طالب علم چشم تصور سے دیکھتا اور غور کرتا ہے تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ دفتری اوقات اور اس کی مصروفیت دوقتہ بارگاہ سلطانی میں حاضری صبح و شام بلکہ رات میں دیر گئے تک علم معقول و منقول کا درس تعطیل میں ہفتہ واری درس، مہینہ میں دو تین مرتبہ شہر سے باہر جشن زرگانہ کا انعقاد اور مشاعروں کا اہتمام اور اس جشن زرگانہ یا مشاعرے کی محفلوں میں مختلف سلطنتوں کے سفیروں اور حاجیوں سے غیر رسمی ملاقات جس میں یقیناً سیاسی مصلحتیں مضمر ہوتیں۔ حکومت کے مفاد میں توازن قوت کو برقرار رکھنا۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو بھی جاری رکھنا ان تمام کاموں پر چوبیس گھنٹوں کو تقسیم کیا جائے تو مصروفیت کو دیکھتے ہوئے وقت کی تنگی کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے۔ اگر وقت کی محتاط تقسیم بھی کی جائے تو علاّمہ کو مشکل سے دو تین گھنٹے سونے یا آرام کے لیے ملتے ہوں گے کیوں کہ ان کی ذکر کردہ مصروفیتوں میں عبادات بھی شامل ہیں۔

عظمت کردار علمی قدآوری

علاّمہ جتنے بلند پایہ عالم تھے اُتنے ہی عظمت کردار میں فائز المرام تھے۔ بقولے:

او ... مرجع اکابر و اہالی و مقصد اعالم و اعالی بود و در نیکی ذات و خوبی صفات و محاسن اشفاق و مکارم اخلاق و آداب بزرگی و

شیوہ فرزانگی قصب السبق از اقران و امثال بود ۷ھ

ترجمہ : وہ اکابرین اور اہلِ علم کے مرجع بلند مرتبہ شخصیتوں کا مرکز تھے ان کی ذات کی نیکیاں صفات کی خوبیاں محبّت و شفقّت، اخلاق بزرگانہ رکھ رکھاؤ عقل و دانش میں اپنے تمام ہم عصروں اور ہم عمروں میں بہت بلند و ممتاز اور سب سے آگے تھے۔

علاّمہ کے ایک شاگرد محمّد بن شرف الدین حُسینی نے اپنی کتاب جوامع الکلام میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

" المولی الاعظم والشیخ الاکرم جامع الصفات مکارم الاخلاق والشیم حاوی سمات اعاظم اہل الآفاق علی الوجہ الاتم

جواد با جد تلدب کریم ؛ تقی فاضل مولی ھمام
محاسن لا یحیط بھا نظام ؛ و محمد لا ینام ولا یرام
وفضل لو قسمت البعض منہ ؛ علی جہل الخلائق لا یتقاموا
وعز شامخ الاطواد تھوی ؛ بجانبہ الکواکب والغمام

ذاک عز الاسلام و فخر المسلمین، اعتقاد اعظم الملوک والسلاطین شمس الملۃ والدنیا والدین ابوالمعالی محمّد بن المرحوم والمبرور علی بن خاتون.... وورد آل مسطورات الشیخ محمّد بن علی بن خاتون العاملی والعیناثی.... کان عالماً فاضلاً ماہراً و محققاً ادیباً عظیم الشان جلیل القدر جامعاً لفنون العلم ۸ھ

ترجمہ: المولی الاعظم سے علی وجہ الاتم تک محمّد بن شرف الدین نے اپنے استاد کے القاب لکھے ہیں۔ اشعار کی تلخیص یہ ہے کہ

" سخی بزرگ فریادرس صاحب لطف و کرم متقی، بزرگ محترم جس کی خوبیوں کا کسی نظام کے تحت احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ جس کی بزرگی کو کوئی پا سکتا ہے اور نہ وہ بزرگی کسی میں پائی جا سکتی ہے۔ (ان کی) فضیلتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اگر ان میں سے بعض کو خلقت خدا کے جہل پر تقسیم کر دیا جائے تو وہ استقامت حاصل کرلیں! اور

عزت کی بلندی اتنی ہے کہ اس کے اِرد گرد کے سیارے اور بادل
پست دکھائی دیں"۔

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ

وہ (علاّمہ) عزّت اسلام فخر المسلمین بادشاہ اور سلاطین کی مجسم
کمک ہیں دُنیا و دین اور (اپنی) ملّت کے سورج ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ امل آمل
میں لکھا ہے کہ شیخ محمّد بن علی بن خاتون العاملی العیناتی ساکن حیدرآباد
عالم، فاضل ماہر و محقق اور عظیم الشان و جلیل القدر ادیب ہیں (اور
جو) جامع العلوم والفنون ہیں انسائیکلوپیڈیا آف شیعہ ہیں آل خاتون
کے عنوان سے علاّمہ کے بارے میں ذرج ذیل عبارت ہے:

شیخ شمس الدین ابو المعالی محمّد (۵۵۔۵۱) فرزند شیخ علی احمد بن
شیخ احمد بن شیخ نعمت اللہ بن خاتون عاملی طوسی آل خاتون از محول
علمائے امامیہ و جامع علوم از شاگردان شیخ بہائی و دارای اجازۂ
از وی بودہ، پس از پیمودن مدارج عالی، اجتہاد در اصفہان مشہد
رضوی را مسکن خویش قرار داد و سپس بہ حیدرآباد دکن ہجرت نمود و
وزارت سلاطین قطب شاہیہ را بہ عہدہ گرفت ۔ ۔ ۔ در حیدرآباد
دکن مسجد بزرگ بنا کرد ۹ھ

ترجمہ: شیخ شمس الدین ابو المعالی محمّد (۵۵۔۵۱) شیخ علی بن شیخ احمد بن
شیخ نعمت اللہ بن خاتون عاملی طوسی آل خاتون کے صاحبزادے
تھے (وہ) شیخ بہائی کے شاگرد اور جامع علوم و علمائے امامیہ میں
سے تھے انہی سے اجازہ حاصل کیا تھا (اور) اجتہاد کے مدارج
عالی طے کر کے مشہد رضوی اصفہان میں سکونت اختیار کر لی اس
کے بعد حیدرآباد دکن ہجرت کی اور سلاطینِ قطب شاہیہ کے
وزیر ہوئے ۔ ۔ ۔ حیدرآباد دکن میں بہت بڑی مسجد تعمیر کی"۔

علاّمہ اپنے عہد کے جامع علوم ہونے کے ساتھ مجتہد بھی تھے۔ انہوں نے یہاں

ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد کا حوالہ حیدرآباد کی تاریخوں میں بھی ملتا ہے لیکن اس مسجد کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ مسجد کہاں تعمیر ہوئی تھی حکیم شمس اللہ قادری نے بھی لکھا ہے کہ:

"علامہ ابن خاتون نے اپنی سعی و کوشش سے ۱۰۴۳ھ میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس وقت لاپتہ ہے لیکن اس کا کتبہ جس پر ابیات ذیل کندہ ہیں کاروان ساہوان کے قریب ٹولی مسجد کے صحن میں اس وقت پڑا ہوا ہے۔"

در زمانِ شاہ خیر اندیش گردوں بارگاہ
یافت اتمام ایں بنا از سعی شیخ پیشوا
خواستم چوں سال تاریخش ز پیر غیب گفت
شد بحکم شاہ عبداللہ این مسجد بنا

[کتبہ لطف اللہ التبریزی] ۱۰۴۳ھ

ترجمہ: خیر اندیش بادشاہ کے زمانہ میں شیخ پیشوا [علامہ] کی کوشش سے یہ مکمل ہوئی۔
جب میں نے پیرِ غیب (فرشتہ سے) اس کی تاریخ (تعمیر) پوچھی
[تو] اس نے کہا عبداللہ (قطب شاہ) کے حکم سے یہ مسجد بنائی گئی۔

اس بات کا یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ علامہ نے بہت سے رفاہی اور سماجی بھلائی کے کام انجام دیئے جیسا کہ مدارس کے قیام اور مسجد کی تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے۔ کسی ملک میں تعلیم کو عام کرنا اور معیارِ تعلیم کو بلند کرنا عوام میں ذوقِ علم کو پیدا کرنا وہ سماجی خدمت ہے جس کو تمام رفاہی کاموں کی فہرست میں سرِ فہرست رکھا جاتا ہے۔ وہ ملک اور وہ سماج ترقی کی بلندیوں کو چھو ہی نہیں سکتا جو علم سے بے بہرہ ہو چکا ہے اس سماج نے دوسرے میدانوں میں کتنی ہی سہولتیں کیوں نہ مہیا کرلی ہوں۔ علامہ نے سماجی میدان میں سب سے بڑی خدمت یہی کی کہ اس ملک میں علم کو عام کیا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے

عہد عبد اللہ قطب شاہ کو انتشار کا دور کہا جاتا ہے لیکن یہ سیاسی انتشار تھا جو شاہی محل اور کار پردازانِ سلطنت کے حدود میں محصور رہا عوامی زندگی غیر متاثر رہی ۔ یہاں گھر گھر علمی چرچے تھے پروفیسر عبد المجید صدیقی نے اپنی کتاب "تاریخ گولکنڈہ" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ سقوط حیدرآباد کے وقت جب لوٹ مچی ہے تو ہر گھر میں چھوٹا بڑا کتب خانہ ضرور ملا ۔ جس سے قطب شاہی دور میں علمی چرچے ہونے کا ثبوت ملتا ہے ۔

ہمیں علامہ کی ماہانہ یا سالانہ آمدنی کے بارے میں کوئی معلومات معتبر نہ مل سکیں لیکن عہدے کی منزلت کو سامنے رکھ کر مکمل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی آمدنی بے حساب تھی ۔ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی پیشوائی کی تنخواہ کو سامنے رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ علامہ علیہ الرحمہ کو بھی ماہانہ ایک ہزار "ہون" (موجودہ ۸۰ ہزار روپیہ تقریباً) ملا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ شاہی سرفرازیوں کی فراوانی الگ سے تھی ۔ علامہ کو جاگیریں بھی ضرور ملی تھیں جیسا کہ ہمیں سینہ بہ سینہ روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے ۔ دولت و ثروت کے اعتبار سے علامہ ہر طرح مستغنی تھے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بادشاہِ وقت عبد اللہ قطب شاہ اور اس کی ماں ملکہ حیات بخش بیگم علامہ کے دولت خانہ میں ایک نہیں دو مرتبہ ایک ایک ہفتہ مہمان رہے ہیں ۔ علامہ نے میزبانی کے فرائض قطب شاہی روایات اور معیار کے مطابق انجام دیئے ۔ اور یہ فخر صرف علامہ ہی کو حاصل ہوا ۔ گولکنڈہ کے بعض قدیم بزرگوں کا کہنا ہے کہ قلعہ کے قریب شیخ پیٹھ گاؤں علامہ ہی کا بسایا ہوا ہے ۔

علامہ کی داد و دہش بھی عام رہی ہے علامہ کی مقبولیت اور عوام کا ان کو محبت کی نظر سے دیکھنا ان کے جود و سخا اور لطف و عطا کی دلیل بنتا ہے ۔ علامہ نے ہر ایسی باصلاحیت شخصیت کی سرپرستی کی اور اس کی ترقی کے امکانی راستوں کو کشادہ کیا جس کو اس کا مستحق سمجھا ۔ سرکاری مصروفیات میں ایسے اشارے دیئے جا چکے ہیں اس سے ہٹ کر بھی انسانی خدمت کے اصول کے زیرِ اثر بھی علامہ نے بڑی انسانی خدمت کی ہے ۔

یولیچی بیگ عبداللہ قطب شاہ کے دربار کی اہم شخصیت تھے۔ انہوں نے ضرورتاً بعض سوداگروں سے کچھ قرض لیا تھا۔ حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ قرضہ وقت پر ادا نہیں کر سکے۔ سوداگروں نے بادشاہ سے شکایت کی۔ شاہی حکم ہوا کہ قرض یولیچی بیگ اپنی جائیداد سے ادا کر دیں۔ تیس چالیس ہزار ہون ادا کر دینے کے باوجود قرضہ بے باق نہ ہو سکا۔ یہ مرحلہ بڑا سخت تھا کسی ذی حیثیت آدمی کے لیے یہ نوبت آجائے کہ وہ دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلائے یا ایک کے قرض کی ادائیگی کے لیے دوسرے سے قرض مانگے بڑی رُسوائی کی بات ہوتی ہے۔ یولیچی بیگ بے حد پریشان تھے علامہ نے ذاتی طور پر قرض ادا کر دیا۔ چونکہ سرکاری عہدہ دار کی بادشاہ سے شکایت سے خود شاہی وقار بھی متاثر ہو رہا تھا۔ علامہ نے ایک طرف یولیچی بیگ کو قرض سے نجات دلادی دوسری طرف بادشاہ کے تکدر کو بھی دُور کر دیا۔ یولیچی بیگ کے بارے میں بادشاہ کے دل میں جو خیالات پیدا ہو گئے تھے انھیں بھی دُور کر دیا۔

دکن کی سماجی تاریخ میں ۱۰۴۷ھ ایسا سال ہے جس میں بعض بڑی علمی شخصیتوں نے داعی اجل کو لبیک کہا ہے۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے ان کے جنازوں میں شرکت کی ہے۔ علامہ کے یہ عمل اہلِ علم سے اخلاص اور انسان دوستی کی اعلیٰ قدروں کی ـــــ حفاظت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ملا خلقی گولکنڈے میں اعلیٰ درجہ کے ایرانی شاعر تھے۔ فاضل شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا شوستر (ایران) کے رہنے والے تھے خلقی شوستری سے مشہور تھے۔ بارگاہ سلطانی کے مقربین میں سے تھے۔ اسی کے ساتھ مدرسہ دارالشفاء میں علم معقول و منقول کی تعلیم بھی دیتے تھے علم جفر کے بھی ماہر تھے علم الامداد سے خاص دلچسپی تھی۔ طلباء کی کثیر تعداد نے ان سے درس لیا اور استفادہ کیا ہے ۱۰۴۷ھ میں انتقال ہوا۔ علامہ سے قریبی ربط تھا۔ علامہ نے ان کے جنازے میں شرکت کی اور قطعہ تاریخ وفات بھی کہا تھا۔ یہ قطعہ دستیاب نہ ہو سکا۔

اِسی سال جس دوسری شخصیت نے انتقال کیا وہ میر سیّد محمّد اسفرائینی کی ہے بڑی لائق شخصیت تھی۔ جب یہ حیدر آباد آتے ہیں تو شہر کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہا تھا کہ

"خوش ترین اقالیم جہاں و بہترین ممالک سلاطین عظیم الشان دار السلطنت حیدر آباد است

دنیا کے تمام بہترین ممالک اور سلاطین میں حیدر آباد کی سلطنت ایک جنّت۔"

۸ ربیع الاوّل ۱۰۴۷ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ علاّمہ نے شہر کے تمام اکابرین کے ہمراہ ان کے جنازے میں شرکت کی صاحب حدیقۃ السلاطین نظام الدین کا مصرعہ تاریخ وفات ہے "بملک بقا رفتہ سیّد محمّد" ۱۰۴۷

مرزا حمزہ استرآبادی محمّد قطب شاہ کے عہد میں حیدر آباد آئے تھے۔ بہت لائق شخص تھے انتظامی صلاحیت عمدہ تھی۔ مرزا حمزہ حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کے صاحبزادے میر مجدالدین کے داماد تھے۔ قطب شاہی حکومت میں کچھ عرصہ کے لیے سرخیلی کے فرائض بھی انجام دیتے۔ ویسے وہ دولت محل میں شاہ کے مقربین میں سے تھے۔ مرض اسہال میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔ علاّمہ نے جنازے میں شرکت کی مرزا حمزہ دائرہ میر محمّد مومن میں مدفون ہیں

میرزا افضل اللہ شیرازی، سادات شیراز سے تھے۔ علم حدیث پر اچھی نظر تھی۔ عبد اللہ قطب شاہ کے ابتدائی عہد میں حیدر آباد آئے۔ علم و فضل کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کرلی۔ عبد اللہ قطب شاہ ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ انہوں نے مذہب شیعہ کے اثبات میں ایک ہزار سنی شیعہ احادیث جمع کر کے ایک مستقل کتاب لکھی۔ اسی سال ان کا بھی انتقال ہوا۔ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے مرزا افضل اللہ کا حیدرآباد میں کوئی عزیز نہیں تھا۔ شاہی حکم سے علاّمہ نے اِن کے سارے اثاثہ کو شیراز بھیج دیا اور ان کے وارثوں میں تقسیم کرادیا۔ علاّمہ نے ان کے جنازے میں بھی شرکت کی۔

شیخ ہارون جزائری بڑے فقیہ تھے۔ لنگر فیض اثر کے مدرسہ میں فقہ کا درس دیتے تھے۔ ان کے تفقہ کی بھی بڑی شہرت تھی۔ انہوں نے اس مدرسہ میں (۴) سال فقہ پڑھائی ہے۔ اسی سال ان کا بھی انتقال ہوا۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے ان کے لڑکوں کو لنگر فیض اثر کے مدرسہ ہی کی مد سے وظیفہ مقرر کر دیا۔

علامہ نہ صرف سرکاری فرائض ہی میں مستعد تھے بلکہ نیم سرکاری کاروبار میں بھی علامہ کا یہی حال تھا۔ بادشاہ اور اس کی والدہ حیات بخش بیگم اپنے سارے کام جن کی خانگی نوعیت ہوتی وہ بھی علامہ علیہ الرحمہ ہی سے لیا کرتے تھے۔

۱۰۴۵ھ کی بات ہے کہ ملکہ حیات بخش بیگم نے ایک محل تعمیر کروانا چاہا۔ اس محل کے لیے امان محل کے قریب جگہ تجویز کی گئی میر محمد سعید سو محل شاہی کی نگرانی میں یہ محل ایک سال میں تیار ہو گیا اور اس محل کا نام "حیات محل" رکھا گیا۔ اس خوشی میں مختلف شعراء نے قطعات تاریخ کہے۔ ملا تکمی کا مصرعہ تاریخ ہے "محل بادشہ ملک و دین حیات محل" محمد قاسم کا مصرعہ تاریخ تھا "گلشن آسمان حیات محل" بطریق تعمیہ ۱۲ اے مرزا روز بہاں کا مصرعہ ہے "کہ شد حیات محل از محال سلطانی"

خود نظام الدین صاحب حدیقۃ السلاطین نے (۶) شعروں کا قطعہ تاریخ کہا ہے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

خسرو عہد شاہ عبد اللہ ؛ کہ بود بادشاہ دین و دول
ساخت قصری کہ زیر پایۂ او ؛ پست بنمود آسمان زحل؟
تا بود عرش برفراز فلک ؛ باد قصر شہی مصوّن زخلل
بہر تاریخ گفت ہاتف غیب ؛ قصر سلطان بود حیات محل

ترجمہ (۱) عبد اللہ قطب شاہ کے زمانہ میں جو دین و دول کا بادشاہ ہے۔
(۲) (ایسا) محل تعمیر ہوا جس کے آگے آسمانِ زحل بھی پست ہے۔
(۳) جب تک آسماں پر عرش قائم ہے (یہ) شاہی محل [ہر آفت سے] محفوظ رہے۔
(۴) ہاتف غیب نے مصرعہ تاریخ کے لیے کہا کہ بادشاہ کا قصر حیات محل ہے۔

قطب شاہوں کا اندازِ داد و دہش بھی خوب ہوا کرتا تھا۔ سال بھر ایسی تقریبات ہوتی ہی رہتی تھیں جن میں داد و دہش کے امکانات کسی نہ کسی پہلو سے پیدا ہوتے رہتے تھے۔

حیات محل تعمیر ہو۔ اور "گھر بھراونی" کی رسم نہ ہو کیسے ممکن تھا۔ محل کا افتتاح ہونا ضروری تھا۔ نظام الدین نے اس محل کے افتتاح کی تقریب کی بڑی تفصیل لکھی ہے اس دعوت کے اہتمام کی ذمہ داری علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے سپرد کی گئی تھی اس تقریب کا جو اہتمام ہوا تھا وہ منظر چشم تصور سے دیکھنے کے قابل ہے۔

چار سو گز طویل دسترخوان کے ایک ہزار لنگر قائم کیے گئے جن پر انواع و اقسام کی کھانے چنے گے علاّمہ علیہ الرحمہ کو حکم تھا کہ جملہ امراے عظام اعلیٰ عہدیدار اس دعوت طعام سے لطف اندوز ہوں مہمان جب کھانے سے فارغ ہوئے تو انہیں سونے کے ورق میں لپٹا ہوا پان اور شربت پیش کیا گیا۔ اس روز شام تک ہر طبقہ کے عوام اس دعوت سے لطف اٹھاتے رہے۔[۱۳]

اس شاہی ضیافت کے دوسرے دن خود بہ نفسِ نفیس حیات بخش بیگم کے جود و سخا کے دروازے کھل گئے اس کی بھی بڑی تفصیل حدیقۃ السلاطین میں موجود ہے عبداللہ قطب شاہ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جو مدد عتبات عالیہ جایا کرتی تھی وہ راستہ کی کچھ دشواریوں کی وجہ سے روک دی گئی ہے کیوں نہ اسے بحال کر دیا جائے۔ بادشاہ نے علاّمہ ابن خاتون سے صلاح مشورہ کیا۔ علاّمہ نے اس نیک کام کے لیے چند متدین اور دیانت دار افراد کو منتخب کیا۔ تاج الدین قمی کو چار ہزار "ہون" شیخ حسین قیاث کو چار ہزار "ہون" دیے گئے انھیں سفر خرچ کے لیے ایک ہزار ہون الگ سے عطا ہوئے اور حکم ہوا کہ یہ نذر ائمہ معصومین علیہم السلام نجف اشرف اور کربلائے معلی میں مستحقین میں تقسیم کر دی جائے۔

اسی طرح کچھ سالوں سے عاشوری کی رقم مسدود کر دی گئی تھی اس رقم کو بھی سنہ ۱۰۴۹ھ میں بحال کر دیا گیا علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اس رقم

کو بھی علما فضلا سادات اور صلحا میں تقسیم کر دیا جائے اِسی کے ساتھ دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ "مبلغ دوازدہ ہزار ہون در پنج شبِ جمعہ جمیع ارباب عمایم کہ وجہ معیشت یک سالہ ہر کدامی باشد دریں پنج شب جمعہ بدولت خانہ عالیہ رفتہ بگیرند" [۱۲].

ترجمہ: ارباب عمایم (علما) اپنی ایک سال وجہ معیشت پانچ شبہائے جمعہ آکر دولت خانہ عالیہ سے حاصل کرلیں۔

ایک مجتہد کو اسلامی اخلاقیات کا مظہر ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ اس کا اجتہاد زیرِ بحث آجاتا ہے۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ مجتہد تھے۔ جن کے رُتبے سوا ہوتے ہیں ان کی مشکل بھی سوا ہوتی ہے۔ فِقہ کی مکمل پابندی لازمی ہوجاتی ہے مجتہد وقت دراصل ایک مثالی کردار ہوتا ہے جس کا عمل دوسروں کے لئے باعثِ تقلید بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر ہونی چاہیئے کہ فِقہِ اسلامی کے دو بڑے شعبے ہوتے ہیں ایک شعبہ "عبادات" کہلاتا ہے جس میں فرد کے لئے عمل کی ساری فروعات تفصیل سے بیان کردی جاتی ہیں دوسرا شعبہ "معاملات" کا ہے جس کا تعلق ہر نوعیت کے باہمی معاملتوں سے ہوتا ہے ایک مجتہد کے لئے دونوں شعبوں پر مکمل عبور ضروری ہوتا ہے۔ مرتبہ کی بلندی کے ساتھ ساتھ معاملات کی پیچیدگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

علامہ ابن خاتون سلطنت کے پیشوا بھی تھے اور مجتہد وقت بھی تھے ان کے سامنے ہر قدم پر بلکہ ہر سانس کے ساتھ ایک کٹھن منزل تھی۔ وہ محض سیاسی دانشور ہوتے تو ڈپلومیسی کے سارے ہتکنڈے استعمال کرتے ملک کی سیاسی صورتِ حال کو اپنے حسبِ حال بنالیا کرتے یہ بات کسی ڈپلومیٹ کے لئے بہت آسان ہے۔ اس راستہ میں جھوٹ سچ کوئی اہمیت نہیں رکھتے ملک کا عارضی یا طویل مُدتی فائدہ پیشِ نظر ہوتا ہے چاہے وہ کسی صورت سے حاصل ہو لیکن اسلامی سیاسیات میں اِس قسم کی کوئی گنجائش نہیں جب ایک مجتہد پیشوائے سلطنت ہو تو اس کو ہر قدم اس طرح اٹھانا پڑتا ہے کہ شریعت سے شمہ برابر انحراف نہ ہونے پائے۔

اب سوچئے علامہ کے سامنے کیسے نازک مرحلے تھے علامہ نے یہ ساری مہمات بہ آسانی سر کرلیں شریعت کے مسائل کی زد سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ بلکہ شرعی مسائل کی پابندی اور حفاظت کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے۔

علامہ کی مجتہدانہ شان شاہجہاں کے معاہدے کے سلسلہ گفتگو میں نظر آتی ہے۔ ایک طرف بقائے سلطنت کا سوال۔ دوسری طرف عوام کی آسودہ زندگی کی حفاظت کا مسئلہ سامنے دشمن کے ارادے جن میں خوں ہی خوں نظر آرہا تھا شریعت ادھر دامن کش ادھر سیاسی دھوکے دینے کے چوڑے راستے۔ علامہ کے سامنے ساری باتیں تھیں۔ یہاں انھوں نے جو شانِ اجتہاد دکھائی ہے وہ بے نظیر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کے جیّد علمار دانشور صالحین اور دنیاوی سیاست پر گہری نظر رکھنے والی شخصیتوں کی بھری مجلس میں متحدہ طور پر ان شخصیتوں کا یہ اعلان کہ علامہ علیہ الرحمہ جو فیصلہ کریں گے، ہمیں منظور ہے۔ علامہ نے نہ شریعت کے کسی دفعہ پر آنچ آنے دی اور نہ اس سے سرمو انحراف کیا۔ ہر فیصلہ برجستہ اور برمحل کیا اس مجتہدانہ جہاد نے حالات میں بہت جلد توازن بحال کردیا۔

علامہ کی فکر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عقائد کے اختلاف کو کبھی زیرِ بحث نہیں لاتے تھے۔ احتیاط ایسی تھی کہ شریعت سبک نہ ہوتے ہوئے مسائل کو خندہ پیشانی سے حل کرتے تھے۔ ہر گام پر علامہ کی روشن فکری اور وسیع القلبی کے مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ علامہ کا ہی فکری رویہ تھا کہ وہ ہر محفل ہر مجلس ہر مقام اور ہر محل پر عوام و خواص کے درمیان ہمیشہ عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔ حق کہنے سے چوکتے نہ تھے باطل خیال کو برداشت بھی نہیں کرتے تھے کسی مسئلہ میں جب رائے دیتے وہ ایسی ہوتی جس پر نہ شریعت کو اعتراض ہوتا اور اہلِ سیاست کو بلکہ انھیں علامہ کی رائے کو ماننے پر مجبور ہونا پڑتا۔ کیوں کہ وہی فیصلہ حق بجانب ہوتا۔

باب (۴) حوالے

۱. حکیم شمس اللہ قادری — مآثر قطب شاہیہ — ص ۶۲

۲. علی بن طیفور — مخطوطہ حدائق السلاطین ورق ۱۹۵ ۓ سالارجنگ لائبریری

۳. ابوالقاسم — حدیقۃ العالم ج ۲ ص ۱۸۳

۴. عبدالجبار ملکاپوری — محبوب الوطن ص ۹۸، ص ۹۷

۵. 〃 — 〃 — 〃

۶. علی بن طیفور — حدائق السلاطین — ورق ۱۶۶ و

۷. 〃 — 〃 — 〃 ۱۹۶ ل

۸. مرزا محمد علی — نجوم السماء — ص ۷۷، ص ۷۶

۹. انسائیکلوپیڈیا ج ۱ — ص ۱۶۵ مطبوعہ ایران

۱۰. نظام الدین — حدیقۃ السلاطین — ص ۲۹۰

۱۱. 〃 — 〃 — ص ۲۱۱

۱۲. تعمیہ. تخرجہ (عام طور پر پہلے مصرع میں ایسا اشارہ دیا جاتا ہے جس کی مدد سے جملہ اعداد میں سے کسی حرف کے اعداد نکال کر تاریخ حاصل کیجاتی ہے اس مصرع کا اولیٰ مصرعہ نہیں ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ کس حرف کے عدد کم کئے جائیں۔

۱۳. نظام الدین — حدیقۃ السلاطین — ص ۲۲۵

۱۴. 〃 — 〃 — ص ۲۲۶

باب (۵)

علاّمہ کی ادبی اور مذہبی خدمات

علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ اپنے عظیم المرتبت اساتذہ کی طرح بڑی قدآور شخصیت کے مالک تھے ان کی ہمہ گیر شخصیت ہر میدان علم میں بہت ہی بلند و بالا نظر آتی ہے۔ علمِ دین کی وسعتوں میں وہ منزلِ اجتہاد پر فائز تھے۔ سماجی علوم کی شاہراہوں پر سیرِ قافلہ تھے۔ علامہ کو علوم دین و دُنیا پر یکساں کمال حاصل تھا۔ علامہ کو جس شعبہ علم میں دیکھا جاتا وہ اسی میدان کے مرد دکھائی دیتے تھے۔ فلسفہ پڑھاتے تو رشک سقراط و افلاطون نظر آتے۔ منطق کی وادیوں میں قدم رکھتے تو ہر قدم استدلال کے گلاب اس طرح کھل اُٹھتے کہ ساری منطق کی وادیاں لہلہاتا سبزہ زار بن جاتیں۔ ریاضی کی طرف رُخ کرتے تو اقلیدس و ہندس آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتے۔ حدیث کے میدانوں میں نکل پڑتے تو سب سے بڑے محدثین کی صف میں دکھائی دیتے۔ فقہ کی دُنیا میں آتے تو اسی مملکت کے اعیان میں سے ہوتے شعر و ادب کی فضاؤں میں ایسے سریع السیر ہوتے کہ فکر و وجدان کی حدیں ان کے اختیار میں ہوتیں اسرار رموز محبت کے ایسے دانائے راز کہ بس اتنا کہہ کر چُپ ہو جاتے۔

سطری کہ در بیانِ رموز محبّت است
ہر نقطہ ئی بعلم افلاطوں برابر است

علامہ سے متعارف ہونے کی کوشش میں ایک محقق کو ایسے مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن کی خیرگی اس کو حیرت کے عالم میں یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ

"اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے"

علامہ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت پریشانی کی منزل اس مرحلہ پر آتی ہے جب طالب علم ان کی سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیت کو دیکھتا ہے۔ وہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ ان دونوں مصروفیتوں میں سے کونسی مصروفیت کس پہ حاوی ہے۔ اور کس مصروفیت کو کس پر ترجیح دی جائے کیوں کہ احساس ذمہ داری کی سطح پہ دونوں مصروفیتیں یکساں طور پر اہمیت کی حامل تھیں۔

ایک پیشوائے سلطنت ملک کی داخلی اور خارجی پالیسی کا تنہا ذمہ دار ہوتا تھا۔ علامہ پیشوائے سلطنت تھے۔ ان کو ملکی مسائل پر خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی ہوں کڑی نظر رکھنا پڑتی تھی۔ بادشاہ سے حضور میں دن میں دو مرتبہ حاضری ضروری تھی۔ ہر محکمہ کی کارکردگی کی نگرانی اور ملک کے نظم و ضبط میں سختی ضروری ہوتی ہے۔ علامہ اس مسئلہ میں سخت تھے۔ انھیں سخت ہونا بھی چاہیئے تھا کیوں کہ پیشوائے سلطنت کی ہلکی سی غلطی یا مسائل ملکی میں تساہل کی روش ساری سلطنت کو متزلزل کر سکتی تھی۔ علامہ علیہ الرحمہ نے اپنے سرکاری فرائض منصبی میں شمہ برابر فرق آنے نہیں دیا۔ وہ سرکاری ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہوتے رہے۔

علامہ علیہ الرحمہ کی فرض شناسی مثالی تھی۔ جس طرح وہ امور سرکاری کی انجام دہی میں ہمیشہ مستعد رہے اسی طرح تعلیمی ذمہ داریوں سے بھی اسی خلوص و انہماک کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ صبح و شام تعلیم دینا۔ شعری محفلوں کا ہر ہفتہ منعقد کرنا۔ مہینہ میں دو تین مرتبہ شہر سے باہر ہفتہ واری تعطیل میں جشن منعقد کرنا۔ ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو تا حدِ امکانی پورا کرنا۔ اسی قسم کے دوسرے سماجی اور نیم سرکاری کاموں جیسے کسی شاہی تقریب کی نگرانی کرنا وغیرہ علامہؒ ان تمام کاموں کو بھی اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر انجام دیتے تھے اپنے وقت پہ عبادتوں کو ادا کرتے اور اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو بھی زندگی بھر جاری رکھے رہے۔

علاّمہ کی ان مصروفیتوں کو اگر کوئی طالب علم دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کرکے دیکھے تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ انتہائی کفایت سے بھی کام لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ کو مشکل سے دو تین گھنٹے ایسے ملتے ہوں گے جس میں وہ سو سکیں علامہ کی زندگی موجودہ دَور ہی کے لئے نہیں بلکہ آنے والے ہر دَور کے لئے مثالی زندگی ہے۔ ہر عہد کا انسان ان کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنا سکتا ہے۔ علاّمہ کی زندگی سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ انسان شب و روز پر پھیلے ہوئے وقت کے میدان کے ہر لمحہ کی اہمیت جان کر اس کو صحیح طریقہ سے صرف کرے تو اس کو اپنی مصروفیت میں وقت کی تنگی کی شکایت کبھی نہیں رہے گی۔ علاّمہ کی زندگی نظم و ضبط کی بہترین علمی تصویر ہے۔

علامہ کی شعری مصروفیت بھی بہت دل چسپ اور بے حد معنی خیز رہی ہے ویسے تو علاّمہ کے دولت خانہ کی محافل شب خالص علمی ہوا کرتی تھیں۔ جن میں مختلف الموضوع مباحث ہوا کرتے تھے شعر و ادب پر نقد و تبصرے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ شہر سے باہر محفلِ جشن کا انعقاد بہت ہی پُرمعنی ہوا کرتا تھا۔ یہ جشن کہنے کو تو ایک طرح کی شعری محفل ہوا کرتا تھا جس میں ملک کے عمائدین، دانشور، شاعر، امراء، روسا اور سب سے بڑھ کر مختلف سلطنتوں کے سفرا شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ جشن ملکی مصلحتوں کے اعتبار سے بڑے اہم تھے ویسے شعری نشست ایک طرح کی تفریح ہوا کرتی تھی لیکن بیرونی سفیروں سے ملاقات اور وہ بھی انتہائی غیر سیاسی حیثیت میں بہت اہم تھی ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات کو ہموار رکھنے میں ان جشنوں سے علامہ بڑی مدد لیا کرتے تھے۔ ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات کو ہموار اور مستحکم بنانے اور اسی دوستی کے سہارے اَمن و امان کو برقرار رکھنے کے امکانات کو تلاش کرنے کے سارے جتن کو کامیابی سے پروان چڑھانا اور ایسی بہت سی باتیں اس جشن سے متعلق تھیں۔

علاّمہ مجتہد تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کی بڑی خدمت کی ہے نثر میں

علامہ علیہ الرحمہ نے پانچ ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں: (۱) شرح ارشاد الاذہان (۲) شرح جامع عباسی (۳) شرح اربعین (۴) کتاب الامامت (۵) تکملہ جامع عباسی۔ ان کے علاوہ علامہ نے دو کتابیں "رسالہ فی جواب البہائیہ" اور "تمہید القوعد" اور لکھی ہیں۔ ان میں سے تمہید القواعد وہ کتاب ہے جس کو علامہ علیہ الرحمہ کی دکن آنے کے بعد پہلی تصنیف کہا جاسکتا ہے۔ اور دراصل اس کتاب کو ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء میں کسی عالم نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا موضوع شیعہ اصول فقہ ہے۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے شیعہ اصول فقہ کی دوسری مستند کتابوں سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کی اور اس پر اپنی توثیقی دستخط بھی ثبت فرمائی یہ کام علامہ علیہ الرحمہ نے ماہ صفر ۱۰۲۱ھ میں مکمل کیا۔ یہ مخطوط عربی زبان میں ہے اور تبریزی خط نسخ میں لکھا گیا ہے [۱۲]۔ "رسالہ فی جواب البہائیہ" ہماری دسترس سے باہر ہے یہ رسالہ عقیدۂ باب و بہا کی رد میں لکھا گیا تھا۔ علامہ نے اس عقیدہ کی بہت مستحکم دلیلوں سے رد لکھی ہے [۱۴]۔ علامہ کی ایک شرح "شرح ارشاد الاذہان" دراصل یہ شیخ جمال الدین ابوالمنصور حسن بن یوسف کی تصنیف ہے [۱۵]۔ جس میں پندرہ ہزار فروعی مسائل بیان کئے گئے ہیں یہ تصنیف عربی زبان میں ہے۔ علامہ ابن خاتون نے فارسی میں اس کی شرح لکھی۔ افسوس ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ کی یہ اہم شرح بھی اب دستیاب نہیں ہے۔ اس کتاب کے فروعی مسائل شیعہ فقہ سے متعلق ہیں [۱۶]۔

علامہ کی یہ نثریات کہنے کو سب کی سب مذہبی ہیں اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے اہم بھی ہیں لیکن ان کی ادبی قدر و قیمت بھی مذہبی قدر و قیمت سے کسی طرح کم نہیں ہے یہ نثریے دراصل مکمل اور معیاری مقالے ہیں جو مختلف الموضوع ہیں اور مقالہ نگاری کا نمونہ ہیں علامہ کے مذہبی ادب کے سرمایہ سے ایک طرف ان کا اندازِ بیان، لب و لہجہ اور اسلوب متعین ہوتا ہے دوسری طرف تفہیم کی ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ مقالہ نگاری کے فن کا شعور بھی جاگنے لگتا ہے۔

علّامہ نے ہر بات کو نہایت سنجیدگی اور علمی متانت کے ساتھ منطقی استدلال کے حصار میں بڑی میٹھی اور شگفتہ زبان میں بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے ہر جگہ مقالہ کی زبان استعمال کی ہے۔ اس دورِ جدید میں جس میں آپ ہم رہتے ہیں مقالے کے بارے میں یہی تو کہا گیا ہے کہ

"مقالہ ادب کی وہ صنف ہے کہ جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور دیانت ہوتی ہے۔ مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ حکمت و فلسفہ یا علم و دانش کے کسی پہلو یا رُخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اس کے دائرے میں قلم کار کو علمی.... فاضلانہ و عالمانہ امور کو سمانے اور سجانے کا پورا موقع ہوتا ہے۔ یہ باتیں یا اس نوع کی تمام سنجیدہ اور حکیمانہ باتیں بڑی اہم ہیں، ان سے ہماری شناسائی ضروری ہے۔ ان کی خشکی، دشوار فہمی یا بے کیفی کے پیشِ نظر ہم ان باتوں کی قدر و قیمت سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے.... (کیونکہ) یہی عالمانہ سنجیدگی مقالوں کی رُوح ہے۔ مقالہ نگار کیلئے دو بنیادی اوصاف لازمی ہیں۔ عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحُسن و خوبی انجام دے سکتا ہے بڑے اور فاضل مقالہ نگار کی شخصیت کا پہلا رُخ عالم کا ہوتا ہے اور دوسرا انشاپرداز کا۔ وہ فقط ادق و اعلیٰ یا کوئی سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا بلکہ عام فہم انداز سے پیش کر کے اسے قابلِ قبول بھی بنا دیتا ہے کامیاب مقالہ نگار وہ ہے جو کام کی بات کام کی زبان میں کہنے کا ہنر جانتا ہے... مقالہ میں علم و حکمت، دانش و فلسفہ... کی ارفع باتیں سپردِ قلم کی جاتی ہیں... مقالہ کی زبان اور بیان صاف، واضح اور دلکش ہوتا ہے... یہ مقالوں کی سہل زبان اور دلکش اندازِ بیان کا سبب ہے کہ ان ادق اور ارفع باتوں کو بلا درد سر ذہنی طور پر بہت کم وقت میں قبول کر لیتے ہیں.... مقالہ کی امتیازی خصوصیت سنجیدگی ہے.. مقالہ نگار کسی موضوع پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی براق ہوتی ہے ایسی براق کہ نفسِ تحریر کا ہر گوشہ منوّر ہو جاتا ہے

اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوع تحریر یعنی نفس مقالہ سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مقالوں کی سنجیدگی اور نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہوتی ہے ۔ اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی فکر مندانہ بے تعلقی ہی دور کر سکتی ہے ۔ مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے اور انشائیوں میں تاثرات کا مقالوں کا کام فکر خیزی ہے اور انشائیوں کا کام کیف انگیزی ۔۔

مقالہ نگار اصلاً معلم ادب ہوتا ہے اس کا کام درس و تدریس ہے ۔ اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں ۔ وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور مدبرانہ انداز میں کہتا ہے ۔ اس میں متانت کے ساتھ دیانت ہوتی ہے اس کا شیوہ لفاظی نہیں وہ جو جانتا ہے کہتا ہے اور جتنا جانتا ہے بتاتا ہے وہ اپنے قاری کو گمراہ یا بدراہ نہیں کرتا ؛" [۴]

اس معیار کو سامنے رکھیئے اور علاّمہ کے مقالات پڑھیئے تو محسوس ہوگا کہ علاّمہ کے سامنے آنے والے زمانوں کے سارے ذہن تھے ۔ آج کا ذہن بھی علاّمہ کی طرزِ تحریر سے خوش اور طریقۂ استدلال سے مطمئن ہو جاتا ہے مقالہ نگار کے لیے جو "دو بنیادی اوصاف" لازمی ہیں ان میں سے ایک عالمانہ شخصیت اور دوسرا ادبی مزاج ہے ۔ علاّمہ علیہ الرحمہ میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے ۔ ان کی زبان علمی بھی ہے اور شگفتہ بھی ۔

علاّمہ کی نثریات میں ہماری دسترس میں شرح اربعین ، ترجمہ قطب شاہی کتاب الایمہ [فضائل مرتضوی] اور شرح جامع عباسی ہیں جو ہمارے دعوے کی مستحکم دلیل بھی ہیں اور توثیق بھی ۔

تکملہ جامع عباسی : ۔ شہنشاہِ ایران شاہ عباس نے اپنے دورِ حکومت میں شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی علیہ الرحمہ سے خواہش کی تھی کہ وہ فقہ امامیہ

پر ایک جامع کتاب لکھ دیں تاکہ عوام و خواص صحت کے ساتھ اپنے اعمال بجا لاسکیں شیخ الاسلام نے "جامع عباسی" کے نام سے کتاب لکھنی شروع کی۔ ابھی پانچ ابواب لکھ سکے تھے کہ ۱۰۳۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ پانچ ابواب جو مسائل طہارات و نجاسات، نماز، خمس اور زکوٰۃ پر مشتمل ہیں بجائے خود ایک مستقل کتاب ہیں۔ ان ابواب کی ضخیم شرح علّامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے کی ہے (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اس کتاب کی تکمیل شیخ الاسلام کے تین شاگردوں نے کی۔ جن سعادت مند شاگردوں نے اس اہم کتاب کی تکمیل کی ان کے نام یہ ہیں ۱: نظام بن حسین ساوجی ۲: علّامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ اور ۳: زین العابدین بن حسین۔ شیخ الاسلام کے ان تینوں شاگردوں نے اس کتاب کے پانچ ابواب میں مزید (۱۵) ابواب کا اضافہ کرکے اور اپنے استاد کی کتاب کو ادھورا رہنے سے بچالیا اب یہ کتاب "جامع عباسی بست بابی" کے نام سے مشہور ہے فقہ امامیہ کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اور آج بھی علمائے فقہ کی درسیات میں شامل ہے۔ موجودہ مطبوعہ جامع عباسی میں عام طور پر صرف نظام بن حسین ساوجی کا نام ملتا ہے لیکن صاحب "کشف الحجب والاستار" نے علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کا نام بھی لکھا ہے۔ طہران کے ایک نسخہ میں زین العابدین کا نام ملتا ہے۔ اس طرح یہ بات کسی الجھن کے بغیر طے ہوجاتی ہے کہ جامع عباسی کی تکمیل تین علماء نے کی اور یہ تینوں علماء شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی کے شاگرد تھے۔[۵]

شرح اربعین ترجمہ قطب شاہی: سرکار ختمی مرتبت کی ایک حدیث کی روشنی میں علمائے اسلام کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ایسی چالیس محکم حدیثیں خاص طور پر منتخب کرکے عام مسلمانوں کے حوالے کرتے ہیں جو نجات کا سامان مہیا کرنے کا سبب بنیں تمام فرقہ ہائے اسلامی کے اکثر علماء نے اس پر عمل کیا اور اپنی اپنی "اربعینیں" لکھیں، "اربعین" یا "اربعون" مستقل اصطلاح ہی بن گئی جس کے معنیٰ چالیس حدیثوں والی کتاب کے ہیں۔ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین علیہ الرحمہ

نے بھی چالیس محکم اور متواتر حدیثیں مرتب کیں اور اس کا نام "اربعون" رکھا۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ نے اپنے استاد کی اس "اربعون" کی شرح لکھی یہ شرح ۱۰۲۵ھ میں یا اس سے پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی۔ علامہ نے اس شرح کا نام "ترجمۂ قطب شاہی" رکھا۔ جب محمد قطب شاہ نے انہیں اپنی سلطنت کے سفیر کی حیثیت سے ایران روانہ کیا تو علامہ نے اس "شرح اربعین" یعنی "ترجمہ قطب شاہی" کو اپنے ساتھ رکھا۔ سرکار شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی اس زمانہ میں بقید حیات تھے۔ علامہ علیہ الرحمہ نے اپنی مبارک و مسعود کوشش کو استاد محترم کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ بھائی علیہ الرحمہ نے شرح کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے شاگرد کی کوشش کو بہت سراہا بے حد تعریف کی اور چند توصیفی کلمات سے نوازا۔ شیخ الاسلام کی یہ تقریظ "ترجمۂ قطب شاہی" کے آخری ورق پر موجود ہے۔ یہ تقریظ ۱۰۲۹ھ میں لکھی گئی۔ اس کے دو سال بعد ۱۰۳۱ھ میں شیخ بھائی علیہ الرحمہ کا انتقال ہو گیا۔ ترجمۂ قطب شاہی ایران میں ۱۲۷۵ھ میں چھپ چکی ہے۔

علامہ نے ان احادیث کی بڑی بسوط شرح لکھی ہے۔ مخطوطہ کا سائز ۸×۱۳ ہے اور ہر ورق پر (۱۷) سطریں ہیں۔ مخطوط کے جملہ اوراق (۳۶۴) ہیں اندازہ کیجیے کہ صرف چالیس حدیثوں کی شرح [۳۶۴] ورق یعنی [۷۲۸] صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ حدیث کو ہر ممکن عنوان سے سمجھایا ہے۔ علامہ کی تشریح کا طریقہ خالص علمی ہے۔ سب سے پہلے حدیث تحریر کر دیتے ہیں اس کے بعد راویوں کا سلسلہ ان احادیث کے ترتیب دینے والے سے شروع کرتے ہیں ہر راوی کے بارے میں دو ایک ایسے تعارفی جملے ضرور لکھ دیتے ہیں جس سے اس کا موثق اور معتبر ہونا ظاہر ہو جائے تاکہ حدیث کے مستند ہونے میں اشکال نہ پیدا ہو۔ یہ سلسلہ کسی معتبر صحابی یا تابعی یا ایسے شخص تک جو تابعی کے مرتبہ کا ہو پہنچاتے ہیں وہاں سے آنحضرتؐ تک۔ اس کے بعد اس حدیث کا ظاہری ترجمہ کرتے ہیں پھر تشریح شروع کرتے ہیں۔ تشریح کرتے وقت انہوں نے مختلف مرحلوں کے مختلف نام رکھے ہیں جیسے "نمائش" وغیرہ۔ شرح کا آغاز اس رباعی سے ہوتا ہے۔

اے از تو حدیث معرفت را آئین ؛ دی ترجمۂ وصفِ تو تنزیل مبیں
گر شکر و آرایش عنوان نبود ؛ تبلیغ رسالت نہ کند روح امیں

ترجمہ: (آنحضرتؐ سے) آپؐ سے معرفت کی باتیں آشکار ہوئیں اور آپؐ ہی کی سوانح کے اوصاف قرآن مبین نے بیان کئے ہیں۔ ہے۔ اگر آپؐ کے شکر کے بعد عنوان (قدس) نہ بجیں تو (گویا) یہ (عمل) ایسا ہے کہ جیسے جبرئیل نے رسالت کی خبر ہی نہیں پہنچائی۔

حدیث اوّل :۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَن حَفِظَ علیٰ اُمتی اربعین حدیثاً مما یحتاجون الیہ فی امور دینهم بعثه الله عز و جل یوم القیامة فقیهاً عالماً۔

شرح کلام معجز نظام .... آنکہ رسول خدای صلی اللہ علیہ وآلہ فرمودہ اند کہ ہر کس حفظ کند از برای امت من چہل حدیث از احادیثی کہ محتاج باشند امت من بہ آن امر دین خود بری انگیز و حشری نماید خدای کہ عزیز است و بزرگ و روز قیامت او را فقیہ و عالم ہے........

"باید دانست کہ حدیث در لغت عرب بمعنی سخنت و سخن را ازیں جہت حدیث می گویند کہ حرف حرف کلمہ کلمہ حادث می شود و در اصطلاح یعنی در عرف ارباب حدیث عبارت از کلامیست کہ حکایت کند یعنی خبر دہد از قول پیغمبر صلوات اللہ و علیہ یا یکی از ائمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین یا قول صحابی یا تابعی یا کسی کہ در مرتبۂ تابعی باشد کہ بریں وجہ بزبان ایشاں جاری شدہ است یا خبر دہد از فعل ایشاں کہ بریں نہج بعمل آوردہ اند یا از تقریر ایشاں کہ بریں صورت در حضور ایشاں بعمل آمدہ منع نکردہ اند یعنی ار علماے حدیث مخصوص دانستہ اند بکلامی کہ حکایت کند از قول یا فعل یا تقریر معصوم و کلامی کہ حاکی باشد از قول صحابی یا تابعی

یا غیر ایشاں را حدیث نمیدانند. مترجم گوید مراد بائمہ معصومین چنانچہ ظاہر است دوازدہ امام اند صلواۃ اللہ علیھم کہ اول ایشاں علی ابن ابی طالب و آخر ایشاں محمد بن الحسن المہدی علیہ و علی آبائہ الکرام.... و مراد بہ صحابی اصحاب پیغمبر اند صلی اللہ علیہ وآلہ و مراد بہ اصحاب پیغمبر بنا برانچہ مصنف دام ظلہ در حاشیہ ذکر کردہ جمعی کہ بسعادت ملاقات آنحضرت استسعاد یافتہ اند بہ بیداری در ایام حیات آنحضرت علیہ السلام در حال اسلام بملاقات عادی و با ایمان از دنیا رفتہ اند"۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میری اُمت (کی فلاح وبہبود) کے لیے چالیس (ایسی) حدیثیں یاد کریں جن کی ان کو دینی مسائل میں ضرورت ہے پروردگارِ عالم ان کو حشر کے دن عالم اور فقیہ محشور کرے گا....

معلوم ہونا چاہیئے کہ لغت عرب میں حدیث کے معنی بات کے ہیں اور بات کو اسی لیے حدیث کہا جاتا ہے کہ اس کا حرف حرف کلمہ کلمہ حادث ہوتا ہے۔ ارباب حدیث کی اصطلاح میں حدیث اس کلام کی عبارت کو کہتے ہیں جو ارشاد پیغمبر کو بیان کرے یا پھر کسی معصوم کا ارشاد ہو۔ یا (یہ حدیث) کوئی صحابی بیان کرے یا تابعی یا وہ جو تابعی کے مرتبہ تک پہنچا ہو۔ اور اس کی زبان سے سنا جائے یا کسی (عمل) رسول کی خبر دے جس کو وہ (پیغمبر کا امام) نے کہا ہو۔ یا پھر تقریر ہو (یعنی) کوئی عمل رسول (مقبول) کے سامنے ہوا ہو اور آپ نے خاموشی اختیار کی ہو۔ بعض علمائے حدیث کا خیال ہے کہ حدیث وہ ہے قول و فعل و تقریر معصوم کو بیان کیا گیا ہو۔ اس کا بیان کرنے والا صحابی یا تابعی ہو اس کے علاوہ کسی کا بیان حدیث نہیں ہوگا مترجم کہتا ہے کہ اس سے مراد ائمہ علیھم السلام ہیں اور وہ بارہ ہیں جن میں اول علی ابن ابی طالب علیہ

اور آخری حضرت مہدی آخرالزماں ہیں صحابی سے مُراد اصحابِ پیغمبرؐ ہیں اور اصحاب سے مراد جیسا کہ مصنف دام ظلہٗ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے بیداری کی حالت میں آنحضرتؐ سے ملاقات کی سعادت حاصل کی ہو اور مسلمان بھی رہے ہوں اور دُنیا سے باایمان اُٹھے ہوں صحابی ہیں۔

یہ حدیث ورق ۷، ۹ سے شروع ہوئی اور (۷، ۱ الف) پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے راویوں کا سلسلہ اس طرح چلا۔ خود بحیر شیخ الاسلام بہاء الدین عاملی ان کے والد عبدالصمد حارثی شیخ محمد کی شیخ جمال الدین احمد (علامہ کے دادا) شیخ علی بن عبد العالی ..... موسیٰ بن ابراہیم ... امام موسیٰ کاظم علیہ السلام حدیث لکھی گئی ہے۔ شرح اربعین کی سولھویں حدیث ملاحظہ ہو۔

شَكَوتُ إِلىٰ رسول الله صلى الله عليه وآله دَيناً كان عَلَيَّ فقال يا علي قل اللّٰهُم بحلالِك عن حرامك وبفضلِك عمن سواك فلو كان عليك مثل صبر ديناً قضا الله عليك وصبر جبل باليمن ليس باليمن جبل اعظم۔

بخواں این دعارا کہ اللھم اغننی بحلالك عن حرامك و بفضلك عمن سواك کہ قرض تو مثل صبرؑ باشد ببرکت خواندن این دعا حضرت عزت عمت عطایاتہ ترا توفیق ادائی آن می دہد و ذمت ترا از شغل آن فارغ می سازد و صبر کوہست در ولایت یمن کہ در یمن کوہی ازان بزرگ تر واقع نیست و خلاصہ این دعا آن کہ بار خدایا غنی ساز مرا بانچہ حلال کردہ آں را بر بندگان خود انچہ حرام ساختہ تصرف در آں بی نیاز ساز مرا بفضل کرم خود از کس کہ غیر تو باشد۔ مصنف دام ظلہٗ بعد از ذکر این حدیث عبارتی ایراد کردہ

است کہ ترجمہ اش اینست در جامع ایں حدیث علی اللہ عنہٗ کہ در بعض سنوات قرض من بسیار شدہ بود چنانچہ مبلغ ان از ہزار پانصد مثقال تجاوز نمود و صاحبان آن تشدد بسیار در طلب آن از من می نمودند و تشویش تقاضاے ایشاں مرا اکثر کارہا خود داشتہ بودہ نمی توانستم ہیچ کارے پرداخت و دست من بعلاجی بواسطہ آن نمی رسید و وسیلہ نداشتم کہ از داستمداد آں نمایم پس مضمون ایں عمل کردم و بخواندن این دُعا مداومت نمودم و ہر روز بعداز نماز صبح بتکرار آن قیام و گاہ بود کہ بعداز نماز ہای دیگر نیز بخواندن آں تبرک می جستم تا آنکہ بہ برکت خواندن دعای مذکور در اندک زمانی ادای آں وجہ شد و اثری آن قرض نماند بسبب بعض امور کہ ہرگز بخاطر نرسیدہ بود و فکر من بپیرامون نگشتہ واللہ الموفق۔"[۵]

ترجمہ: "میں نے آنحضرتؐ سے اپنے مقروض ہونے کی شکایت کی آپؐ نے فرمایا یا علیؑ کہو پروردگار حلال افعال کی مدد سے حرام کاموں سے بچائے اور اپنے سوائے دوسروں کے کرم سے محفوظ رکھے اگر تمہارا قرض "صبر" کی طرح ہے تو اللہ اسے ادا کر دے گا "صبر" یمن کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے جس سے بڑا کوئی اور پہاڑ وہاں نہیں ہے۔" اس دُعا کو پڑھا کرو اللھم اغنی بحلالِكَ عن حرامِكَ و بفضلِكَ اگر تمہارا قرض کوہ صبرؔ کے برابر بھی ہے تو وہ اس دُعا کی برکت سے ادا ہو جائے گا۔ پروردگار عالم اس کی ادائیگی کی سبیل پیدا کر دے گا۔ "صبر" یمن کے پہاڑوں میں سب سے بلند پہاڑ ہے۔ اس دُعا کا خلاصہ یہ ہے کہ خدایا اپنے بندوں پر حلال کی ہوئی چیزوں سے مالا مال (غنی) کر دے اور ان چیزوں سے

بے نیاز کر دے جن کو تُو نے ان پر حرام کیا ہے۔ مصنف دام ظلہٗ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں چند برسوں میں قرضدار ہو گیا تھا ایک ہزار پانسو مثقال سے زیادہ قرض ہو گیا تھا۔ قرض دینے والوں نے (واپسی کے لیے) شدت پیدا کر دی تھی ان کے تقاضوں سے میری تشویش بڑھ گئی کاروبار متاثر ہو گئے۔ میرے (سارے) کام متاثر ہو گئے میں کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کوئی (ایسا) وسیلہ نہ تھا کہ (میں) ان سے مدد مانگتا۔ میرے ہاتھ میں اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ میں نے یہ دُعا مسلسل پڑھنا شروع کی۔ (ہر) نماز صبح کے بعد اس کا وِرد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر نماز کے بعد بھی پڑھا کرتا تھا۔ اس دُعا کی برکت سے راستے نکل آئے۔ قرض کا بوجھ ہلکا ہوا۔ پھر ایسی نوبت کبھی نہیں آئی کہ تفکرات مجھے گھیر سکیں۔"

شرح جامع عباسی

شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی نے فقہ امامیہ پر جامع عباسی کے نام سے جو کتاب لکھنی شروع کی تھی اس کے صرف پانچ لکھ سکے تھے کہ ۱۰۳۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ پانچ ابواب بہت ہی جامع تھے اور مزید تشریح کے محتاج تھے۔ علاّمہ ابنِ خاتون علیہ الرحمہ نے مشکل کو آسان کر دیا اور ان پانچ ابواب کی بسوط شرح لکھی۔ وہ شرح حاشیہ کی شکل میں تھی۔ علاّمہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی کا نسخہ سالار جنگ لائبریری میں بہ نشان شرح جامع عباسی F.L.24 موجود ہے ۱۰۵۴ھ میں علاّمہ ہی کی محفل کے ایک رکن برہان تبریزی نے ان حواشی کو کتابی شکل دی اور کتابی شکل دینے کی وجہ بھی بیان کر دی۔

"چوں مصنف (شیخ الاسلام شیخ بہائی) در انچہ اختصار نمودہ .... بخاطر .... علامی فہامی .... محمد بن علی .... رسید درصدد نخستہ دران فرد گذاشتنی کہ سبب اختصارش شد تدارک نمودہ

تفصیل دہند۔۔۔۔ الحمد للہ کہ توفیق ایشاں گردید مطالب دقیقہ را در نہایت وضوح فرمودہ در حاشیہ کتاب تحریر نمودند ۔۔۔۔ چوں اکثر اوقات کاتبان در نوشتن حواشی نسیان نمودہ حاشیہ مطلبی رانزدیک بہ مطلب دیگر می نوشتند و ایں دوراز مدعای محشی بود کمترین بندگان برہان تبریزی ما استصواب ایشان حواشی را بطریق شرح ۔۔۔ کتاب نوشتہ و تحریری اوا خر شہر ربیع الاخر سنہ اربع خمسین الف

ترجمہ: چونکہ مصنف (شیخ بہائی علیہ الرحمہ) نے اس میں اختصار سے کام لیا ہے۔ علامی فہامی ۔۔۔ محمد بن علی ۔۔۔ کے دل میں آیا کہ اس کے اختصار سے (قاری) سے قبل اس کے کہ کوئی فرد گذاشت ہو اس کا تدارک کر دیں اور تفصیل دیں۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ توفیق ہوئی مشکل مطالب کو کتاب کے حاشیہ پر نہایت وضاحت سے لکھا۔۔۔ چونکہ اکثر اوقات کاتبین حواشی کی کتابت کے دوران بھول کا شکار ہو جاتے ہیں اور حاشیہ کا دوسرا ہی مطلب لکھ جاتے ہیں اور وہ حاشیہ نگار کے مطلب سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کمترین برہان تبریزی نے (علامہ سے) رضامندی لے کر ان حواشی کو کتاب کی شکل دی

تحریر اواخر ربیع الاخر سنہ ۱۰۵۴ھ

سنہ ۱۱۱۲ھ میں میر محمود ولد حبیب اللہ الحسینی نے برہان تبریزی کی کتاب کا ایک اور نسخہ مرتب کیا سنہ ۱۲۵۰ھ میں ایک اور نسخہ نواب سرفراز جنگ کے حکم سے لکھا گیا ہے اس نسخہ کے آخر میں تحریر ہے۔

"در مقام فرخندہ بنیاد حیدر آباد بتاریخ نوزدہم شہر شعبان المعظم یک ہزار دو صد و پنجاہ ہجری حاشیہ جامع عباسی حسب الحکم۔ ۔۔۔ سرفراز جنگ باتمام رسید۔"

ترجمہ: بتاریخ ۱۹ ر شعبان المعظم سنہ ۱۲۵۰ھ کو سرفراز جنگ کے حکم سے

حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں حاشیہ جامع عباسی مکمل ہوا۔

نمونۂ متن اور اس کی شرح ملاحظہ ہو۔ متن چہارم ہے

انکہ نماز واجب در مسجد گذاردہ شود

ترجمہ: یہ کہ واجب نماز مسجد میں ادا کرنی چاہیئے

حاشیہ (شرح) :۔ خصوصاً نماز یومیہ را افضل آنست کہ در مسجد گذارند تا متہم بہ ترک نشوند خصوصاً کہ خانہ نزدیک در مسجد داشتہ باشد چہ در حدیث وارد ست کہ لا صلواۃ لجار المسجد و بواسطہ مداومت پیغمبر صلوات اللہ علیہ والہ برآں و نماز ہای نافلہ خصوصاً نوافلہ شب افضل آنست کہ در خانہ گذاردہ شود بواسطہ نجات از در افتادن بریاکہ بدترین مفاسد است ۔ الخ

ترجمہ: خاص طور پر یومیہ نماز بہتر ہے کہ مسجد میں ادا کریں تاکہ ترک نماز کا الزام نہ آئے خصوصاً جبکہ مسجد گھر کے قریب ہو حدیث میں وارد ہوا ہے کہ (مسجد سے ہٹ کر) اس کے پڑوسی کی نماز نہیں! آنحضرت نے اس کی مداومت کی البتہ نافلہ نمازیں (نوافل) خصوصاً نمازِ شب بہتر ہے کہ گھر میں ادا کرے گھر کے باہر فساد (نفس) کا سبب ہے

کتاب الامامت : کتاب الامامت علامہ علیہ الرحمہ کی آخری تصنیف ہے۔ یہ کتاب ایک سے زیادہ ناموں سے مشہور ہے جیسے "فضائل مرتضوی"، "کتاب الامۃ"، "کتاب الامامت" وغیرہ اسی لیے اس کتاب کو مجہول الاسم بھی کہا گیا ہے۔ علامہ کی یہ تصنیف بہت ضخیم ہے۔ جلد (۴۰۲) اوراق پر مشتمل ہے سالار جنگ لائبریری کا یہ مخطوطہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد میں (۲۰۰) اوراق اور دوسری جلد میں (۲۰۲) اوراق ہیں۔ اس مقالہ کا موضوع کلام ہے علامہ نے اپنے اس مقالہ میں حضرت علیؑ کی امامت کا منصوص من اللہ ہونا ثابت کیا ہے آج کل کسی مقالہ کے آخر میں حوالے کی کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ لیکن علامہ علیہ الرحمہ نے آغاز ہی میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن سے انہوں نے

استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ کو تحریر کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ

ابن قلیل البضاعت را.... بموجب من تشبہ بقوم فھو منھم.... بخاطر رسید کہ رسالہ جداگانہ در اثبات امامت بحق پیشوای مطلق ساقی حوضِ کوثر امیرالمومنین حیدر صلوات اللہ علیہ.... بنویسد [۱]

ترجمہ :۔ اس ذرہ بے مقدار نے اس (ارشاد کے) بموجب کہ جو جس قوم کی شباہت اختیار کرتا ہے اسی میں شمار ہوتا ہے یہ خیال کیا کہ ساقی کوثر امیرالمومنین حیدر صلوات اللہ علیہ کی امامت کے اثبات میں الگ سے ایک رسالہ لکھوں۔

علاّمہ علیہ الرحمہ نے امام کے لفظ کی تشریح کس قدر صاف اور سلیس زبان میں کی ہے ملاحظہ کیجئے اس سے علاّمہ کے اسلوب کو سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا۔

امام در زبان عرب پیشواؔ سردار مقدم درکارہا است۔ لھذا پیش نماز جماعت را امام می گویند و در فرقہ ناجیہ اثنا عشریہ شخصی را گویند کہ از جانب خدای حق تعالیٰ ذکرہ بخلافت و نیابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعین شدہ باشد.... ولفظ امام ووصی وخلیفہ ونائب ولی و جانشین ہمہ یک معنیٰ است..... بعضی عرفا گفتہ اند کہ مراد از امام و خلیفہ کسی است کہ از جانب حق تعالیٰ بواسطہ کارسازی ورہنمائی خلقان معین شدہ باشد۔ [۱۲]

ترجمہ :۔ زبان عرب میں پیشوا، سردار اور کاموں میں سب سے آگے رہنے والے کو امام کہتے ہیں لھذا پیش نماز جماعت کو بھی امام کہا جاتا ہے۔ فرقہ شیعہ اثنا عشریہ میں اس شخصیت کو امام کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے رسولؐ کا نائب اور خلیفہ مقرر ہوتا ہے.. اور لفظ امام ووصی و خلیفہ ونائب رسول وجانشین ہم معنی ہیں۔ ... بعض عارفین کا کہنا ہے کہ امام اور خلیفہ وہ ہوتا ہے جس

پروردگارِ عالم اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے متعین کرتا ہے۔

اس کتاب کے آخر میں چند شعر کا قطعہ لکھ کر مقالہ کا اختتام فرمایا ہے۔

شکر حق راکہ این خجستہ کتاب ؛ کہ درو نیست غیر صدق و ثواب
ہمہ مدح علی وآل علیست ؛ ہر کہ باایں عقیدہ ہست ولیست
بود پنجاہ ہشت بعد ہزار ؛ کہ بہ پایاں رسید این گفتار

ترجمہ (۱) خدا کا شکر ہے کہ یہ وہ پاکیزہ کتاب ہے جس میں صدق و ثواب کے سوائے اور کچھ نہیں ہے (۲) اس میں (جو کچھ ہے) وہ سب (حضرت) علیؑ اور اولادِ علیؑ کی تعریف ہے جس کا یہ عقیدہ ہو وہ ولی ہے۔

(۳) (یہ کتاب) سنہ ایک ہزار اٹھاون [۱۰۵۸ھ] میں اختتام کو پہنچی

زندگی کے اعلیٰ اقدار کی نظری اور عملی مثالیں مذہبی ادب ہی میں کثرت سے ملتی ہیں۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ مذہبوں ہی نے انسان کو آسودگی کا راستہ دکھایا ہے اور نیک و بد پاک اور نجس کی تفصیل دے کر انسان کو بُرائی سے بچایا اور اچھائی کی راہ سے آشنا کیا ہے۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کا سارا سرمایہ مذہبی ادب ہے۔ مذہب نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ علامہ نے بھی مذہب ہی کے راستہ سے اعلیٰ اخلاقی اقدار سے قطب شاہی تہذیب کو آراستہ کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ علامہ کی مذہبی نثریات محض مذہبی نثریات ہی تک محدود ہیں بلکہ ان کی ادبی قدر بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ انہوں نے جو مذہب ہی کی شاہراہ سے ادب کی بھی خدمت کی ہے۔ علامہ کے نثری جواہر پارے آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ ان کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ان نثر مقالہ کی نثر ہے شگفتگی بھی اپنے کمال پر ہے ادب کا علمی وقار بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ آج کی بلکہ ہر دور کی مقالہ نگاری کے اصول میں جو اہم باتیں ہونا ضروری ہو گی نیز وہ یہ ہیں:

(۱) مقالہ میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور دیانت ہوتی ہے۔

[۲] اسی میں حکمت، فلسفہ یا علم و دانش کے کسی پہلو پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے

[۳] مقالہ نگار میں عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

[۴] مقالہ کی زبان کا صاف و سادہ اور بیان کا واضح اور دلکش ہونا ضروری ہے۔

[۵] مقالہ نگار کو کام کی بات کام کی زبان میں کہنے کا ہُنر جاننا ضروری ہے۔

[۶] مقالہ نگار پہلے عالم ہوتا اور اسی کے ساتھ انشا پرداز بھی۔

[۷] مقالہ نگار بنیادی طور پر معلم ہوتا ہے درس و تدریس ہی اس کا کام ہوتا ہے

[۸] مقالہ نگار کا شیوہ لفاظی نہیں ـــ وہ جو جانتا ہے وہ کہتا ہے جتنا جانتا ہے سُناتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو گمراہ یا بدراہ نہیں کرتا۔

علامہ ابن حاتون علیہ الرحمہ کی ساری نثری تخلیقات کو اس پیمانہ معیار کوئی اور میزان پر رکھ کر جانچیے، تو لیئے اور پرکھئے تو پورے پاول رتی پائیے گا بلاّ کے مقالے اس معیار پر نہ صرف پورے اترتے ہیں بلکہ آنے والے مقالہ نگاروں کیلئے مثال بن گئے ہیں۔ علامہ اپنے وقت کے مجتہد تھے حکمت و فلسفہ اور علوم منقول و معقول پر کامل دستگار رکھتے تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا سیر حاصل بحث کی وہ ادق مضامین کو صاف ستھرے واضح اور دلکش انداز میں بیان کرنے کے ہنر سے خوب واقف تھے! انہوں نے جو کیا پوری علمی دیانت کے ساتھ کیا اور لفظ لفظ سے علمی متانت کے چراغ روشن کئے۔ فلسفہ کی گتھیاں سلجھائیں۔ اپنی نثریات میں سلاست روانی۔ دلکشی اور شگفتگی کی رُوح کو سمو دیا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ کے عہد کے سارے دانشوروں نے تسلیم کیا ہے۔ اسی لیے علامہ کی دیوڑھی میں علمی چہل پہل سدا بہار رہتی اسی عہد میں علامہ کی نثریات کا صحیح جائزہ لیا گیا ہے

عبارا تی صاف تراز آب زلال و اشاراتی خوش تراز سحر حلال

در سلک تحریر کشیدہ بود۔[۱۳]

(علامہ کی) عبارتیں شفاف پانی سے زیادہ شفاف ہیں اور (علمی) اشاروں کا تحریر میں سجاو سحر کی دلکشی سے زیادہ دلکش ہے۔

علامہ نے مذہبی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لیے علمی جہاد کیا ہے

اس کا حاصل ایسا ادبی سرمایہ ہے اہل زبان وادب کے ہاتھ آیا جس نے فارسی زبان وادب کو مالامال کر دیا علاّمہ کی شگفتہ نثر اپنی آپ مثال ہے۔ علاّمہ نے جو بات سمجھائی اس طرح سمجھائی کہ اس پر تھوڑی توجہ دی جائے اور دلچسپی سے پڑھی جائے تو وہ دل میں اتر جاتی ہے اور دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔

علاّمہ جس طرح نثر کی دُنیا میں بلند پایہ مقالہ نگار تھے اسی طرح گلستان شاعری میں بلبل ہزار داستان تھے۔ کلام میں گہرائی، گیرائی اور شیرینی منفرد اسلوب اور لب و لہجہ کے ساتھ آمیز ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ان کی استادی ایک ایک بیت سے مسلم ہوتی ہے۔ جس شعر کو لیجئے اظہار استادانہ ملتا ہے۔

سطری کہ در بیان رموز محبت است ؎ ہر نقطہ ئی بعلم فلاطوں برابر است

پایہ شعر دیکھئے۔

جاں اگر بنظر تنگ آیدش چہ عجب ؎ کسی کہ شوق تو در دل جہاں جہاں دارد

جز موسیائی نگهش کئی شود درست ؎ رنگی کہ در فراق رخ او شکستہ شد

علاّمہ کا شعری سرمایہ دیوان کی شکل میں دستیاب نہیں ہے۔ علی بن طیفور نے جو اپنے کو علاّمہ کا شاگرد بلکہ "غلام کمترین" کہتا ہے اپنے تذکرہ حدائق السلاطین میں کچھ شعر جمع کر دیئے ہیں یا پھر علاّمہ کے کچھ شعر ان کے نثری سرمایہ میں ملتے ہیں جو انہوں نے نثر کو دلآویز بنانے کے لیے جگہ دیئے ہیں جیسا کہ انہوں نے کتاب الامامت کا اختتام اپنے ہی اشعار پر کیا ہے۔ جن کو پچھلے صفحات میں ہم نے پیش کیا ہے۔

علاّمہ نے غالبًا منظوم خطوط بھی لکھے تھے۔ صاحب تذکرۃ الشعرا طاہر نصر آبادی نے علاّمہ کے منظوم خط سے اپنے تذکرہ کو زینت دی ہے۔ یہ منظوم خط علاّمہ نے طاہر کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

ز نظم پرسش آنیت شدم گرم ثنای تو ؎ اُمید عافیتها دارم اکنوں از دعای تو

ز بیماری ندارم غم شفا م را چو خواہانی ؎ کہ مبدا م بر آرد لطف یزدان مدعای تو

ترجمہ (۱) آپ کی منظوم مزاج پرسی نے میری فکر کو آپ کی ثنا کے لیے جولان کر دیا اب میں آپ کی دُعاؤں سے اپنی عافیت کی اُمیدیں وابستہ کیئے ہوئے ہوں۔

(۴) چونکہ آپ نے میری صحت یابی کی خواہش کی ہے اس لیئے مجھے اپنی بیماری کا غم باقی نہیں رہا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی دُعاء نے رحمتِ الٰہی کو پر لگا دیئے ہیں
صاحب حدائق السلاطین کے جمع کردہ اشعار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ علیہ الرحمہ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ غزل، قصیدہ، رُباعی، منقبت، سلام وغیرہ اصناف علاّمہ کے زیرِ مشق رہے ہوں گے۔ بقول ڈاکٹر نجمہ صدیقہ کے۔

"وہ (علاّمہ) کہنہ مشق نثر نگار اور شاعر تھے"

ان کی غزل میں جامی اور نظامی کے لہجہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لفظوں کے سجاؤ سے شیرینی اور نغمگی خود بخود اُبھر آئی ہے۔ یہ لطافت و شیرینی اور وجدان انگیز نغمگی کہیں اور ملتی ہے تو وہ صرف اہل تصوف کے کلام میں ملتی ہے۔ محترمہ ڈاکٹر نجمہ صاحبہ نے علاّمہ کے کلام کا صحیح تجزیہ کیا ہے کہ علاّمہ ایک تجربہ کار جہاں دیدہ ماہرِ نظم و نسق تھے۔ وہ صوفی نہیں تھے لیکن صوفیوں اور تصوف کے تعلق سے ان کا رویّہ منفی نہیں تھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ

"کسی تامل و تذبذب کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ (علاّمہ) اپنی علمی، ادبی اور حقیقی زندگی میں تصوف اور صوفی کے خلاف نہیں تھے ان کی غزل کا مرکزی نقطہ یا خیال یقیناً حُسن اور عشق ہے لیکن ان کی محبت میں نہ ابتذال ہے اور نہ یہ محبّت نفسانی ہے اور نہ ہی اس تصورِ عشق کو اُبھارتی ہے جو صوفیوں کا مسلک ہے" [۱۴]

علاّمہ نے تصورِ عشق کو ایک اور ہی رُخ سے پیش کیا ہے جو زیادہ حقیقی بھی ہے اور دل آویز بھی۔

"انہوں (علاّمہ) نے عشق کے مرکزی تصور کے اطراف ایسے سنجیدہ فِطرت تجربوں کا حصار کھینچ دیا ہے جو انسان کی دیانت کی علامت ہیں" [۱۵]

علاّمہ کے کلام کے اطراف عظمت انسان، راستی، صداقت و حق گوئی سنجیدگی

و متانت کی چکا چوند ہے جو قاری کو رُک کر تھم کر اسے پڑھنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ساتھ ہی اسے ایک ذہنی آسودگی بھی مہیا کرتی ہے۔

پئے تسلی او بوے پیرہن کافی ست ؛ حدیث مصر بگوئید پیر کنعاں را

علامہ کا کلام صنائع لفظی و معنوی اور خوبصورت تلمیحوں سے مزین ہے۔ علامہ کا انداز فکر اور طرز اظہار اپنے دور کے روایتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی مختلف و منفرد ہے ان کی سوچ کے دائرہ کا محیط بہت وسیع تھا۔ علامہ حقایق کو لطیف و نازک پیرایہ میں بیان کرنے کا فن خوب جانتے تھے۔

بہ ہر دری کہ گذشتم ز خش بسوئے تو بود ؛ توئی جو مقصد کل حرف کفر و ایماں چیست

سراپا سوختم در آتش عبرت بگو تا کی ؛ تو باشی شمع بزم غیر و من پروانہ در صحرا

شیخ مارا با صراحی رغبت از ماہت بیش ؛ لیک زہد خشکش از نمازی قلقل تراست

علامہ کے کلام میں مقامی تہذیبی اقدار کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔

نہ تنہا کفر دل در عہد ان دلداری زیبد ؛ کہ ایماں راز زلف او بکف زناری زیبد

علامہ سرکاری ذمہ داریوں سے جس طرح عہدہ برا ہوتے رہے اسی طرح علم و ادب، اخلاق، مذہب کی نشر و اشاعت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ایسی متعدد ذمہ داری کو زندگی بھر نبھاتے رہے بذاتِ خود مذہب و ادب کی جو خدمت کر سکتے تھے وہ تو کما حقہ انجام دی اس کے علاوہ اس میدان میں جن جن سے جو کام لے سکتے تھے ان سے وہ کام لیا۔ علامہ کے گرد موضوع پر مہارت رکھنے والا دانشور اور عالم موجود تھا۔ مرزا فضل اللہ سے ارشادات معصومین جمع کروائے اور انھیں کتاب کی شکل دی "جنگ قطب شاہی" سے یہ کتاب معروف ہے اس کتاب کا موضوع فقہ ہے مرزا نظام الدین الصاعدی سے حدیقۃ السلاطین جیسی مستند تاریخ لکھوائی علی بن طیفور بسطامی جید عالم تھا، اور زبردست انشا پرداز بھی تھا۔ علامہ علیہ الرحمہ کا ایسا گرویدہ تھا کہ شاگرد کی بجائے اپنے کو فخریہ انداز میں علامہ کا "غلام کمترین" کہا کرتا تھا "نہ شاگردم غلام کمترینم"، علامہ نے اس سے بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ عربی کی "مجالس الادب" کو اس نے علامہ کی ایماء پر

"ترجمۂ مکارم اخلاق" نام سے فارسی میں منتقل کیا۔ "تحفہ قطب شاہی" بھی اسی نے لکھی۔ علاّمہ کے ایک اور چاہنے والے برہان تبریزی نے پہلے تو علاّمہ کے جامع عباسی کے حواشی کو کتابی صورت میں مرتب کیا اس کے علاوہ برہان قاطع جیسی لغت بھی لکھی۔ علامہ کے حلقۂ درس کے ایک اور شخص محمد علی نے فارسی کے ضرب الامثال "مجمع الامثال" کے نام سے جمع کئے۔ یہ چند مثالیں ہیں جن سے علاّمہ علیہ الرحمہ کی علمی میدانوں میں کاوشوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح اور بہت سے موضوعات پر اس دور میں کتابیں لکھی گئیں یقیناً ان تمام علمی کاموں کو علاّمہ کی سرپرستی ضرور حاصل رہی۔ اس علمی سرگرمی، چہل پہل اور گرم بازاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کا عہد جسے سیاسیات کے ماہرین اپنے زاویہ نگاہ اور بعض سیاسی حالات کے تحت انتشار کا عہد کہتے ہیں تہذیبی سطح پر علمی رونق کیا پُر بہار تھا۔ ہوسکتا ہے کہ سیاسی خلفشار نے حکومت کو پریشان کر رکھا ہو اور یہ سیاسی اُلجھن درون خانہ نہیں تھی بلکہ طاقتور سلطنت مغلیہ کی لالچی نظروں کا نتیجہ تھی جو کسی بھی لمحہ دکن کو ہڑپ کر جانے کے لیئے موقع کی تاک میں تھی۔ یہاں کے تمدن کا علمی وقار اہلِ دانش کے لیئے بے شک مرعوب کن تھا۔

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ اور علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے علمی جہاد اور ان میں کامیابیوں نے یہاں کے تمدن کو بلند اخلاقی اقدار کے زر جواہر سے سجایا تھا۔ اس ثقافت کی سنجیدگی اور متانت، شائستگی اور شرافت ہمہ رخی آسودگی قطب شاہی مملکت کے ہر شہری کے لیے ذہنی تسکین کا سبب بنی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف ملکوں کے علما، شعراء، ادباء اور ماہرین فنون جوق در جوق حیدرآباد کا رُخ کرتے رہے اور حکومت ان کے مرتبہ کے شایانِ شان سرپرستی بھی کرتی رہی۔

علاّمہ کی شاعری:۔ حقیقی شاعر اپنے عہد کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور مستقبل کی نشاندہی بھی کرتا ہے آنے والی نسلوں کے لیے ارتقائے فکر کے راستے روشن بھی کرتا ہے اور ہموار بھی۔ علاّمہ کی شاعری میں زندگی کی ہما ہمی بھی ہے اور

بلند فکر کی وسعتیں بھی ہیں۔ ان اشعار سے علامہ کا لب و لہجہ رنگ و آہنگ اور طرز اظہار بھی متعین ہوتا ہے اور علمی متانت بھی آشکار ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور غزل کے شاعر تھے۔

بی جمالت کئی دلِ تاریک ما روشن شود ÷ پرتوِ خورشید یابد ظلمتِ ویرانہ را
بگلستاں فرحی بی تو گر بود زانت ÷ کہ در فراق تو گل رنگ زعفراں دارد

یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے علامہ کے چند اشعار حدائق السلاطین مرتبہ ڈاکٹر شریف النساء صاحبہ سے دیئے جاتے ہیں یہ اشعار علامہ الرحمہ کے اندر چھپے شاعر کا بہترین تعارف بھی ہوں گے۔

شکر خدا کہ دلبر ما شد بکام ما ۱ خوانند خطبۂ غم عشقش بنام ما
بزمی کہ جم زحسرت آں رفت بزم ماست ۲ جامی کہ خضر تشنۂ آن بود جام ما
ما مغرب عذار تو در زلف دیدہ ام ۳ داغست سینۂ سحر از فیض شام ما

وقت آن آمد کہ از می جاں دہم پیمانہ را ۴ برگل و نسریں کنم داماں عشرت خانہ را
بی جمالت کئی دل تاریک ما روشن شود ۵ پرتو خورشید یابد ظلمت ویرانہ را
باز دل از بی غمی زنجیر می خواہد کجاست ۶ سیلیٔ عشقی کہ عاقل سازد ایں دیوانہ را

ز رخ نقاب برانداز تا دہم جان را ۷ کہ دل بزلف تو دارد و درست پیماں را
دچاک سینۂ براری دل از غمش آہی ۸ بدست صبر دہد پیش ازیں گریباں را
بی تسلیٔ او بوے پیرہن کافیست ۹ حدیث مصر مگوئید پیر کنعاں را

ازاں گر داشت مجنوں در غمش کاشاد صحرا ۱۰ کہ عشرت خانہ در شہر است دلی غمخانہ در صحرا
بجای خوشہ چیں در ہر قدم صد دانہ چیں بینی ۱۱ کند گر کاکل مشکین خود را شانہ در صحرا
سراپا سوختم در آتش غیرت بگو تا کئی ۱۲ تو باشی شمع بزم غیر و من پروانہ در صحرا

سطری کہ در بیان رموز محبت است ۱۳ ہر نقطۂ بعلم فلاطوں برابر است
خونی بر یخت غمزۂ مرد انگشت دلی ۱۴ ہر ناوک نگاہ بصد خوں برابر است

زاہد از توبۂ مستانۂ ما خندد چہ ۱۵ چہ تواں کرد کہ از عالم ما بے خبرست

چو دل ز خضر لبت بادہ حیات گرفت ۱۶ شکستہ کشتی ما ساحل نجات گرفت
بسعی و کوشش کس نیست عاتئی غم عشق ۱۷ کجا بہ سعی کسی چشمۂ حیات گرفت
فلک مگر پیچے کنیم ز دور خود وا ماند ۱۸ کہ بے مداری کار دلم ثبات گرفت

عجب بداں غمت از دیدہ ر انجواب گرفت ۱۹ کہ دل ز خجلت دوری برخ نقاب گرفت
مگر خیال تو کاہی ددیدہ در نظر است ۲۰ کہ ہم نشیں ز گل اشک من گلاب گرفت

جہاں اگر بنظر تنگ آیدش چہ عجب ۲۱ کسی کہ شوق تو در دل جہاں جہاں دارد
جز مومیائی نگہش کی شود درست ۲۲ رنگی کہ در فراق رُخ او شکستہ شد
نی عصائی سبحہ ظاہر می کند تنزویر شیخ ۲۳ می تواں معلوم کرد از پیچش دستار ہم
شیخ مارا با صراحی رغبت از ناہت بیش ۲۴ لیک زہد خشکش از غمازی قلقل تراست

بہر نور دیدئ یعقوب مصر دوستی ۲۵ صد گلستاں عطر کئی چوں بوے پیراہن شود
عاتئی رانیست در دل مطلبی جز وصل یار ۲۶ چرخ خواہد دوست گرد د خواہد از دشمن شود
عاتئی داغ جنونت شور در عالم فگند ۲۷ یافت آخر ایں سر شوریدہ ساماں خیر باد
نہ تنہا کفر دل در عہد آں دلداری زیبد ۲۸ کہ ایماں لا ز زلف او بکف زناری زیبد
اجل پیرایہ ساز شام ہجراں تو می گردد ۲۹ بلا در پیچ و تاب از زلف پیچاں تو می گردد
قضاے دلبری بیش است رخش آہستہ تر می راں ۳۰ کہ جان یک جہاں دل گرد میداں تو می گردد

چہ حسنت اینکہ خلقی را بخود اغیاری سازد ۳۱ چہ عشق است اینکہ دل را از خرد بیزاری سازد
سرِ ستانہ چشمی کردم وا عجاز اطوارش ۳۲ کہ خود را خواب و بخت خفتہ را بیداری سازد
دلا با نیک و بد در ساز و خو کن با شکیبائی ۳۳ کہ شاخ گل گہی با گل گہی با خاری سازد
تا رخت را بہ سہو مہ گفتند ۳۴ مہر را آرزوی ماہی شد!
تا بزلف تو یافت شب نسبت ۳۵ روز ہم طالع سیاہی شد!
یافت تا رتبہ گدای تو ۳۶ عالمی را خیال شاہی شد!
پئے شکستن گل گہ گہی بباغ خرام ۳۷ کہ صد گرہ بدل غنچہ از تغافل تست
ببرد یاری خود عالمی ببناز کہ دہر ۳۸ رہین خواب گران از مئی تحمل تست
تا بنای چرخ مینا بودہ است ۳۹ عشق را بنیاد برپا بودہ است
گریہ ام در عشق طوفانہا نمود ۴۰ عاشقاں را چشم دریا بودہ است
وصل شد روزی و دل ساکن نشد ۴۱ درد عاشق را مداوا بودہ است
بخوردہ ام مئی وصلی خمار ہجراں چیست ۴۲ نہ دیدہ نشئہ لطفی عتاب جاناں چیست
بیا بمصر و ببیں صحبت زلیخا را ۴۳ مگو کہ ایں ہمہ غوغای پیر کنعاں چیست
بہر دری کہ گذشتم رخش بسوی تو بود ۴۴ توی چو مقصد کل حرف کفر و ایماں چیست
رخ دلبر چو نمایاں شود رات بیار ۴۵ آشنائی بہ نگاہ غلط انداز مکن!
برسرِ طور محبت ہوس آلود مرو ۴۶ سحر را محرم ہنگامہ اعجاز مکن!
عشق را از سر وحدت بجدا راہی ہست ۴۷ اندریں راز کسی را بخود انباز مکن!
تسبیح کہ بی ذکر خدا دند بود ۴۸ در دست ملک اگر بود زنار است
حرف ہجراں بہ ارباب محبت کفر است ۴۹
زناز بندگی دور م زبزمت بگو یاری ۵۰ کہ مہجور مرا محرومیٔ دیداری زیبد

رُباعیات

ای آنکہ بخویش گفتگو ہا داری | در فکر نظر بر برد بالا داری
ای کشمکش تکثرات باکی نیست | گر بادۂ توحید مصطفیٰ داری

چوں نیک نظر کنی جہاں میداں ہست — ہر کس پئے نفعِ خویش دو کاں ہست
ہر چیز بہر چہ می خری ہست گراں ۲ — جز مہر کہ گر بجاں خری ارزاں ہست

در سلک عاشقی جدائی است حرام — اندیشۂ از درد رہائی ست حرام
بیگانۂ خویش شو کہ با خویشتن ۳ — در شرع محبت آشنائی ست حرام

مہرت چو بیادِ دلِ مدہوش آید — عقل و خرد و ہوش فراموش آید
کشتی غم از دلم دور شود ۴ — دریائے محبت چو در جوش آید

علامہ علیہ الرحمہ نے مذہبی شاعری خاص رنگ و آہنگ میں کی ہے۔ علامہ کے حمد باری تعالیٰ کا انداز دیکھیئے۔

صفاتت واجب آمد ہمچو ذاتت ۱ — کجا ممکن کند درک صفاتت
صفاتت را چو ذاتت نیست مانند ۲ — کہ دانش ناخنی در وی کند بند
در امثال ایں چنیں آمد کہ موری ۳ — نگندی در سراز توحید سوری
بہر آں دُری کہ در توحید سفتی ۴ — قیاسِ آں زخود کردی و گفتی
ہر آں وصفی کہ کردی وصف مور است ۵ — ترا در وصف ایزد دیدہ کور است
نہ جسم ست و جسمانی نہ جوہر ۶ — حکیم ست و علیم ست و سخن در
کمال علم با در وصف داور ۷ — بود با دانش آں مور ہمسر
کجا خفاش و پرواز ہمای ۸ — کجا ادراک و اوصاف خدای
نسازد تا غرورت زندہ پیلی ۹ — نمادنت ز علم الّا قلیلی
بایں علم قلیلی پر دلی چیست ۱۰ — دلی از لاف دانش ممتلی چیست

پروردگارِ عالم کی اس خوبصورت تاثر کن حمد کے بعد عجز و انکسار اس کی بارگاہ میں اس طرح دست بدعاء ہیں۔

خداوندا بعجزم را بسپر کن ۱۱ — غرور دانشم را بی سپر کن
دلی دہ محرم راز الٰہی ۱۲ — زبان شکر پاش بے گناہی

گزاں جز دفع خود بینی نیا بد ۱۳ وزیں جز عجز و مسکینی نیا بد

اسی بحر و نیز اسی تسلسل میں نعت سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہٖ اور منقبت حضرت علی علیہ السلام جس خوبصورتی سے کہی ہے اس سے علامہ کے منفرد انداز بیان کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اس کے علاوہ فکر کی متانت اور زبان کی مٹھاس سے متاثر ہو کر قاری ایک وجدانی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے

محمد کافرینش باوجودش ۱۴ بود رشحی دواز دریای جودش

شعاعِ آفتاب بے زوالی ۱۵ گل خوشبوی باغ ذوالجلالی

چراغ اصطفا روشن زنورش ۱۶ رموز حق مبین از زبورش

باد نازان دل مشکل کشائی ۱۷ از و خندان لب معجز نمائی

سلیمان مہان سالار خوانش ۱۸ کلیم اللہ عصادار شبانش

خلیل آتش پرست شوق رویش ۱۹ ذبیح اللہ بدی طوف کویش

خضر دردی کش بزم کمالش ۲۰ مسیحا طوطیٔ ہند جمالش

بنی را محرم اسرار او بود ۲۱ نہ بد در غار یار غیار او بود

چو ہر کس را بدینش راہبر بود ۲۲ ازاں روشہر علمش راچو در بود

رہ او پوی گر دینت قویم است ۲۳ کہ راہ او صراط المستقیم است

ز گل گشت رخش ہر صبح گردو ۲۴ گل خورشید ارد ارمغانی

پی حفظش دعای صبح خیزاں ۲۵ توسل جستہ از سبع المثانی

ترجمہ (۱) خدا کا شکر ہے کہ میرا مدعا ہی میرا محبوب ہو گیا (لوگ) اس کے غم عشق کو میرے نام سے بیان کرتے ہیں۔

(۲) جمشید جس بزم کی حسرت میں گزر گیا وہ ہماری بزم تھی (اور) خضر تشنہ (لب) کو جس پیمانہ کی خواہش تھی وہ ہمارا جام تھا۔

(۳) (اے محبوب) ہم تیرے مغرب رخسار کو (سیاہ) زلفوں میں دیکھ رہے ہیں ہماری شام کا فیض ہے کہ سینۂ سحر داغ (عشق) بنا ہوا ہے۔

(۴) وقت آگیا ہے کہ پیمانہ کو شراب سے زندگی دوں گھر کو پھولوں سے دامن

عشرت بنادوں (۵) (اے محبوب) تیرے حُسن (کے جلووں کے) بغیر ہمارا تاریک دل کیسے روشن ہوگا۔ ویرانے کے اندھیروں کو پرتو خورشید چاہیئے۔
(۶) دل کا شاہین بے غمی سے (آسودگی) کی زنجیر مانگتا ہے (وہ) کہاں ہے۔ عشق کا تازیانہ دیوانے کو ہوشیار بنا دیتا ہے۔
(۷) اپنے چہرے سے نقاب کو اُلٹ دے کہ مَیں جاں نذر کروں کہ دل نے تیری زلفوں سے اپنے عہد و پیماں (محبت) کو قائم رکھا ہے۔
(۸) اس کے غم میں (جب تک) دل کی آہ سینہ چاک کر کے باہر نہ آجائے اس وقت تک اپنے گریبان کو صبر کے ہاتھ میں نہ دو۔
(۹) ان (حضرت یعقوبؑ) کی تسلی کے لیے (حضرت یوسف) کے پیرہن کی خوشبو کافی ہے کتنا ان کے ان ضعیف (حضرت یعقوبؑ) سے مصر کی کہانی یا روئیداد بیان نہ کرو۔ (۱۰) اگر مجنون نے اپنے (محبوب کے) غم میں صحرا کو اپنا گھر بنالیا ہے تو (ٹھیک ہے) کہ عشرت کدے تو شہر میں ہوتے ہیں اور ایوان غم صحرا میں۔
(۱۱) اگر (محبوب) اپنی زلفوں کو صحرا میں سنوارے (کنگھی کرے) تو ہر قدم صحرا میں نافۂ (آہو) کی خوشبو مہک جاتے۔
(۱۲) میں سرو قد غیرت کی آگ میں کب تک جلتا رہوں تو بزم غیر کی شمع بنا ہوا ہے اور میں صحرا کا پروانہ۔ (۱۳) اسرار و رموز محبت کے بیان کی ہر سطر کا ایک ایک نقطہ افلاطون کے علم کے برابر ہے (۱۴) (محبوب کے) غمزوں (ناز و ادا) سے (جہاں) ایک عاشق گھایل ہوتا ہے (وہاں) اس کی نگاہ سے سو (چاہنے والوں) کا خون ہوتا ہے۔ یعنی ناز و ادا سے ایک گھایل ہونے والا تیر نگاہ سے سو گھایل ہونیوالوں کے برابر ہے (۱۵) اے زاہد تو ہماری توبۂ مستانہ پر کیوں ہنستا ہے تو ایسی (جرأت) کیسے کرسکتا ہے (جبکہ) تو ہمارے حال سے بے خبر ہے۔
(۱۶) جب تیرے لبوں کے خضر نے دل کو شراب حیات پلادیا ہماری ٹوٹی ہوئی کشتی ساحل مُراد تک پہنچ گئی (۱۷) اے سائل کون ہے (جس نے) اپنی کوشش سے غم عشق کی (دولت) حاصل کی ہے۔ (بھلا) کوئی اپنی سعی سے چشمۂ حیات پا سکا ہے۔

(۱۸) میرے دل کو کسی مدار پر حرکت (گردش) کئے بغیر ثبات مل گیا۔ اور آسمان مجھ سے اپنی کینہ پروری کرتے کرتے تھک گیا۔

(۱۹) حیرت ہے کہ (ادھر) تیرے غم میں آنکھوں کی نیند اُڑ گئی اور [ادھر] دل نے تجھ سے دور رہ کر چہرے پر نقاب ڈال لی ہے۔

(۲۰) تیرا خیال نگاہوں میں (مجسم) ہوکر دوڑ رہا ہے میری آنکھوں سے گل اشک گر رہے ہیں میرا ہم نشین ان گلابوں کو حاصل کر رہا ہے۔

(۲۱) کسی کے دل میں تیری محبت کی دُنیا آباد ہے تو وہ خود ایک وسیع دنیا ہے اگر اس کو یہ دُنیا تنگ نظر آئے تو حیرت کی کیا بات ہے۔

(۲۲) (عاشق کا) رنگ اس کے (محبوب) کے رُخ (زیبا) کے فراق میں ٹوٹ گیا ہے اب وہ اس (محبوب) کی نگاہوں کی مومیائی کے بغیر کیسے دُرست ہوگا۔ (مومیائی ایک موثر دوا ہے جس سے ہڈیاں جوڑی جاتی ہیں)

(۲۳) شیخ کے فریب کو اس کی عصا اور تسبیح ہی سے نہیں (بلکہ) اس کی دستار کی تہ پیچوں سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

(۲۴) ہمارے شیخ صاحب کو صراحی (شراب) کی چاہت ہم سے زیادہ ہے لیکن ان کا زہد خشک صدائے قلقل کو دبا دیتا ہے۔ (۲۵) حضرت یعقوبؑ کی نگاہوں کے نُور کے لیے مصر سے ربط کی کوئی حقیقت نہیں (حضرت یوسفؑ) کے پیرہن کے خوشبو کے آگے سیکڑوں گلستانوں کا عطر ہیچ ہے (۲۶) عالی کے دل میں وصالِ یار کے سوائے کوئی تمنا نہیں ہے (ہمیں اس سے غرض نہیں) کہ آسماں چاہے ہمارا دوست بنے یا دشمن ہو جائے۔ (۲۷) اے عالی تیری دیوانگی کے شور نے ساری دُنیا سر پر اُٹھالی ہے (مبارک ہو) اس سرِ شوریدہ نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

(۲۸) (محبت میں) صرف تنہا دل کا کافر ہو جانا (کچھ) بھلا نہیں لگتا جب تک ایمان کے ہاتھ میں گیسوئے (محبوب) کی زنار زیب و زینت نہ بن جائے۔

(۲۹) [اے محبوب] تیرے فراق میں ہر شام فرقت میرے لیئے پیغام موت لاتی ہے اور بلائیں تیری زلفوں کے خم میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

(۳۰) فضائے دلبری بہت وسیع ہے تو اپنے سمندناز کو آہستہ چلا کیونکہ ایک جہاں کے عاشقوں کی جاں تیرے میدان کے گرد گھوم رہی ہے کہیں اِس سمندناز کی تیزگامی سے (وہ) گھائل نہ ہو جائے

(۳۱) تیرا کیسا حُسن ہے کہ ساری دُنیا کو اپنا غمیر بنالیا ہے اور عجب عشق ہے کہ دل کو عقل سے بیزار کردیتا ہے (۳۲) جب میں مستانہ وار اس کی طرف نظر کرتا ہوں تو اس کے اطوار کا یہ اعجاز ہے وہ سوئی ہوئی قسمتوں کا جگا دیتا ہے۔

(۳۳) اے دل تو صبر کے ساتھ نیک و بد سے نبھانے کی عادت ڈال لے کیوں کہ شاخِ گل کو کبھی پھولوں کا ساتھ ہوتا ہے اور کبھی خاروں سے کام پڑتا ہے۔

(۳۴) لوگ تیرے چہرے کو غلطی سے ماہ کہتے ہیں اس لیے سورج کو ماہ کی آرزو ہوئی۔ جب سورج نکلتا ہے تو چاند چھُپ جاتا ہے وہ چاند کو دیکھ نہیں سکتا ہے لوگ تیرے چہرے کو چاند سے تشبیہہ دیتے ہیں اس لیے سورج کو چاند کے دیکھنے کی خواہش ہوئی

(۳۵) جب تک کہ شب کو تیری زلفوں سے نسبت رہے گی دن کے (افق سے) سیاہی طلوع ہوتی رہے گی (۳۶) عالی کو تیرے (در کی) گدائی کا مرتبہ کیا مِل گیا (کہ) وہ اپنے کو بادشاہ سمجھنے لگا (۳۷) (اے محبوب) تو گا ہے گا ہے چمن کی سیر کرلیا کر (چمن سے) تیرے تغافل نے کلیوں کے دل میں سوسو گرہیں ڈال دی ہیں۔ یعنی تو چمن میں آئے گا تو کلیاں کھلیں گی۔ (۳۸) عالی خود کبھی دُنیا میں اپنے آپ پر ناز کرنے لگتا ہے کہ اس کی جو یہ میٹھی نیند ہے وہ تیری محبّت کی شراب کی وجہ سے ہے چوں کہ تیری محبّت مجھے حاصل ہے میں بےفکری سے میٹھی نیند سو سکتا ہوں اور اپنے آپ پر ناز کرتا ہوں ع "ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"؛

(۳۹) عشق کی بنیاد اسی دن پڑ گئی جس دن چرخ نیلی نام قایم ہوا۔ (یعنی عشق ابتدائے آفرینش سے قایم ہے) (۴۰) عاشقوں کے لیے میری آنکھ نے دریا کا کام کیا یعنی وہ سیلاب اشک میں ڈوب گئے۔ (۴۱) وصل تو حاصل ہو گیا لیکن دل کو سکون میسر نہ آسکا عاشق کے درد کا (خوب) علاج ہوا ہے (۴۲) جس نے وصل کی شراب نہیں پی ہے وہ فراق کا خمار کیا سمجھے گا۔ جو محبوب کے لُطف سے واقف نہیں وہ اس کے عتاب

کو کیسے جانے گا (۴۳) مصر میں آؤ اور زلیخا کی کیفیت دیکھو۔ یہ نہ کہو کہ پیر کنعان [حضرت یعقوب] کا رونا کیا ہے (یعنی رونا محبت کا تقاضہ ہے)۔

(۴۴) میں جس گھر کی طرف سے بھی گذرا اس (گھر کے) دروازے کے رُخ کو تیری طرف پایا جب تو ہی کل یافت ہے تو پھر یہ کفر و ایمان کیا ہے۔

تیرا ملنا تیرا نہیں ملنا ٭ اور جنّت ہے کیا جہنم کیا"

(۴۵) جب محبوب کا چہرہ نظر آئے تو [اپنے وجود] کو اس کی طرف لے آ۔ اور کسی غیر پر نگاہ غلط انداز نہ ڈال۔ (۴۶) طور محبت پر ہوس کی آلودگی کے ساتھ نہ جا اور جادو گر اعجاز کا محرم نہ بنا (۴۷) خدا کی قسم راہ وحدت ہی عشق کا راستہ ہے تو اس راز کا کسی کو محرم نہ بنا (۴۸) ذکر خدا کے بغیر فرشتے کے ہاتھ میں بھی اگر تسبیح ہے تو وہ جنیو ہے [تسبیح نہیں ہے] (۴۹) ارباب محبت (کی زبان پر) ہجر کا حرف بھی کفر ہے (کیوں کہ) عشق (عین) وصل ہے اس میں فراق کی آلودگی نہیں۔

(۵۰) [اے محبوب] تو ہی بتا اگر میں اپنی بندگی پر ناز کرتا ہوا تیری بزم سے دُور بھی رہوں (تو کیا) مجھ بجز نصیب کو اپنے دیدار سے محروم رکھنا تجھے زیب دیتا ہے۔

رُباعیات

[۱] اے وہ کہ جو خود کلامی میں مصروف ہے فکر کے ہر اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہے اگر اس نے شراب ولائے مصطفیٰ پی لی ہے تو وہ کثرت (کے ہنگامے) سے نہیں گھبراتا۔

[۲] اگر دنیا کو نیک نیتی سے دیکھیں تو وہ وسیع میدان ہے (اگر) مفادات کی (تمنا میں) دیکھیں تو دُنیا ایک دوکان ہے یہاں ہر چیز ہر قیمت پر بکتی ہے (البتہ) محبّت کو اگر جان دے کر بھی خریدیں تو سستی ہے۔

[۳] عاشقی کے مسلک میں دوری (جدائی) حرام ہے اِسی طرح قیدِ عشق سے رہائی بھی حرام ہے اپنے سے بے نیاز ہو جا کہ محبت کی شریعت میں (احساس انا) یا اپنے آپ سے محبّت کرنا بھی حرام ہے "مزا تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا"

(۴) جب (عالمِ سرخوشی میں) مست و مدہوش دل میں تیری یاد آتی ہے تو عقل و خرد و ہوش جاتے رہے اور جب تیرے دریائے محبت میں جوش آیا ہے تو میرے دل کے (سارے) غم رفتہ رفتہ دُور ہو گئے۔

حمدِ باری تعالیٰ کے چند شعر

(۱) (اے پروردگار) تیری صفات عین ذات ہیں۔ تیری صفتوں کا ادراک کہاں ممکن ہے (۲) جب تیری صفات کو تیری ذات سے نسبت دی جاتی ہے تو عقل کے ناخن اس گرہ کو نہیں کھول سکتے۔ سالک راہِ عشق ہی اس معمہ کو حل کر سکتا ہے (۳) تو خداوند تعالیٰ کی توحید کے متعلق جو فکر کرتا ہے وہ ایک چیونٹی کے برابر ہے۔ ابھی تک اس کا عرفان حاصل ہی نہیں ہوا ہے۔ حقیقت توحید معلوم ہی نہیں ہوئی۔ (۴) (خود سے خطاب کر کے) تو نے توحید میں (فکر کے جو موتی پروئے ہیں وہ تیرا (محض) قیاس ہے جو تو نے بیان کیا ہے۔

(۵) تو نے (جتنے بھی) وصف بیان کئے ہیں چیونٹی کے برابر ہیں تو سمجھتا ہے کہ تو نے وصف خداوندی کو دیکھا ہے (تو سمجھ لے کہ) تو اندھا ہے" یعنی تجھ کو ابھی تک عرفانِ حق حاصل نہیں ہوا ہے۔

(۶) (پروردگارِ عالم کا) نہ جسم ہے نہ جسمانیت نہ جوہر (وہ ہر چیز سے منزہ اور مبرہ ہے) (۷) اوصاف (خداوندی) کے بارے میں ہمارا علم کمال عقل و دانش کے باوجود چیونٹی کے جیسا ہے (یعنی بے حد کم ہے)۔

(۸) کہاں چمگادڑ اور کہاں ہما کی پرواز (اسی طرح کہاں خدا کے اوصاف اور کہاں (معمولی انسان) کا ادراک (۹) تو ہاتھی (کی طرح جھوم جھوم کر) غرور نہ کر تو علم قلیل کے سوائے کچھ نہیں جانتا (۱۰) اس معمولی سے علم پر یہ گھمنڈ کیا ہے اور دل کو عقل کی شیخیوں سے مملو کر لینا کیسا ہے (یعنی علم کی کمی کے یقین کے ساتھ عقل و دانش کا گھمنڈ بے معنیٰ ہے) (۱۱) پروردگار (انتہائی انکسار کے ساتھ) عرض ہے کہ میرے عجز کی رہبری کر میری عقل کے غرور کو تہتا کر دے۔

[۱۲] (اے پروردگار) میرے دل کو اپنے اسرار کا محرم بنا دے اور زبان کو گناہوں سے بچنے کا عادی بنا۔ [۱۳] اس سے خودبینی کو دفع کر سکتے ہیں اور اس سے سکینی آتی ہے۔

نعت و منقبت

[۱۴] حضرت ختمی مرتبتؐ دریائے جود و سخا کے دو قطروں کے باعث پیکر ذات سے آراستہ ہوئے [۱۵] وہ آفتاب لازوال کی شعاع ہیں اور باغ ذوالجلال کے پھول کی مہک ہیں [۱۶] چراغ اصطفا اس کے نور سے روشن ہے اور اسرار و رموز اس کے صحیفہ سے آشکار ہے۔ [۱۷] اس (حضرت ختمی مرتبتؐ) کے وجود پر مشکل کشائی ناز کرتی ہے اور معجز نمایاں منقسم ہیں۔

[۱۸] ان (پیغمبر اسلامؐ) کے دسترخوان کے سربراہ حضرت سلیمان ہیں اور کلیم اللہ ان کے ریوڑ کے نگراں ہیں۔ [۱۹] (جناب ابراہیم) خلیل خدا اس (نبی) کی تابش رخ کے پرستار تھے اور ذبیح اللہ (حضرت اسمٰعیلؑ) اس کی گلی کا طواف کرنے والی قربانی ہیں۔ [۲۰] حضرت خضر ان کی بزم کے درد (تلچھٹ) آشام تھے اور حضرت مسیح ان کے جلال کے قصیدہ خوان تھے۔

[۲۱] حضرت علی حضرت نبی اطہر کے محرم اسرار و رموز تھے غار میں تو نہ تھے لیکن ان کے یار غار تھے۔ [۲۲] آپ (حضرت علیؑ) دین پیغمبر کے ماننے والوں کے رہبر تھے اس رخ سے آپ (حضرت علیؑ) شہر علم نبی کا دروازہ تھے۔

[۲۳] اگر تو اس کی راہ پر چلے تو تیرا دین مستحکم ہے کیوں کہ اس کا راستہ صراط مستقیم یعنی اس کا راستہ سیدھا راستہ ہے۔ [۲۴] آسمان ہر صبح کو تیرے گلستاں کی سیر کرتا ہے اور خورشید تیرے لیے تحفہ لاتا ہے۔

[۲۵] اس کی حفاظت کے لیے ہر صبح دعا کے لیے چودہ (سبع المثانی) کے توسل کو تلاش کرتا ہوں۔

مندرجہ بالا اشعار ثابت کرتے ہیں کہ علامہ علیہ الرحمہ استاد سخن تھے علامہ کے کلام میں محاسن کی تابانی دانش کی خیرگی، فکر کا غلو مطالب کی گہرائی و گیرائی اسلوب کی ندرت عرفان کی روشنی وجدان کی کیفیات فلسفیانہ نکات

کی چہل پہل اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ علامہ اتنے مصروف رہتے ہوئے اتنا ڈوب کر شعر کیسے کہتے ہونگے علامہ کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر فکر کا آدمی ان کو پڑھ کر لطف اٹھاتا ہے۔

باب (۵) حوالے

(۱) علامہ ابنِ خاتون — تمہید القواعد F.1.136/2 مخطوطہ سالار جنگ لائبریری

(۲) ڈاکٹر سید اطہر عباس — ہندوستان میں شیعت (انگریزی) ص ۳۴۰ 〃 〃

(۳) حکیم شمس اللہ قادری — ماثر قطب شاہیہ ص ۶۱ 〃 〃

(۴) سید محمد حسنین — انشائیہ اور انشائیے ص ۱۶ تا ص ۲۲ اسٹیٹ لائبریری

(۵) حکیم شمس اللہ قادری — ماثر قطب شاہیہ ص ۶۴ سالار جنگ لائبریری

(۶) علامہ ابن خاتون — ترجمہ قطب شاہی مخطوط ورق ۷ ب 〃 〃

(۷) 〃 — 〃 〃 ورق ۹ و 〃 〃

(۸) 〃 — 〃 〃 ورق ۱۵۹ اب تا ۱۶۱ 〃 〃

(۹) 〃 — شرح جامع عباسی مخطوط فقہ جامعہ ۲۰۲ ورق ۱ و محکمہ مخطوطات و تحقیقات شرقی

(۱۰) 〃 — 〃 ورق ۱۶۴ و 〃 〃

(۱۱) 〃 — کتاب الامامت ورق ۶ و سالار جنگ لائبریری

(۱۲) 〃 — 〃 〃 ورق ۷ ب 〃 〃

(۱۳) علی بن طیفور — حدائق السلاطین ص ۲۲۳ مرتبہ ڈاکٹر شریف النساء حسن سالار جنگ لائبریری

(۱۴) ڈاکٹر نجمہ صدیقہ صاحبہ — عہد قطب شاہیہ میں فارسی زبان و ادب (انگریزی) ص ۵۱۶

(۱۵) ڈاکٹر نجمہ صدیقہ صاحبہ — عہد قطب شاہیہ میں فارسی زبان و ادب (انگریزی) ص ۵۱۶۔

باب [۶]

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے ہمعصر

گولکنڈہ سلطان قلی قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہیہ کے عہد ہی سے آفاقی علما دانشوروں اور ماہرین فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطنت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ماہرین فنون اور صاحبان کمال کی آبادی میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ

"قطب شاہ علم و ادب کی سرپرستی کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے ...... اور علما و فضلا کے بڑے قدر دان تھے ....

ان ہی اسباب نے قطب شاہی دربار کو ارباب کمال کا مرکز بنا دیا تھا علمائے شیعہ کی جماعت کثیر ایران اور عراق سے آکر حیدرآباد میں جمع ہو گئی تھی۔ ایرانی شعرا بھی کافی جمع ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے تلنگانہ ایران کا نمونہ بن گیا تھا.... دارالحکومت حیدرآباد کی وہی کیفیت تھی جو صفویوں کی وجہ سے اصفہان میں پیدا ہو گئی تھی"۔ [1]

چنانچہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ نے اپنے ایک قصیدہ میں محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد کی مدح کرتے ہوئے شہر حیدرآباد کی تعریف اس طرح کی ہے

سرمہ شد خاک تلنگانہ ز فرخ پائے تو ۞ ای فدای خاک پاکت ہر زمان جان نوی
گر صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ ۞ حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

ترجمہ: تلنگانہ کی خاک تیرے (محمد قلی قطب شاہ) مبارک قدموں سے (آنکھوں کا) سرمہ بن گئی ہے تیرے قدموں کی خاک کے نثار کو زمانہ نے نئی زندگی پائی ہے۔ اگر شاہ عباس صفوی سے اصفہان کو زندگی ملی ہے تو حیدرآباد نے بھی اصفہان کی طرح تیری وجہ سے نئی زندگی پائی ہے۔

علّامہ علیہ الرحمہ کے ہم عصر مشاہیر جو راست یا بالواسطہ علّامہ سے وابستہ رہے ہیں یقیناً ایسے تھے جنھوں نے قطب شاہی تہذیب کو مستحکم کرنے میں نیز علم وادب کو ملک کے طول و ارض میں پھیلانے میں علامہ سے بھرپور تعاون کیا۔ اس تعاون میں کبھی جھول نہیں آنے دیا حکومت کے سماجی ارتقاء اور ثقافتی استحکام والے منصوبوں کو بروئے کار لانے میں بھی ان مشاہیر کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ انہوں نے باصلاحیت ذہنوں کو حیدرآباد میں اکٹھا کرنے کے لیے ان تھک کوشش کی تاکہ حیدرآبادی تہذیب کو زیادہ سے زیادہ مضبوط شاندار اور شائستہ بنایا جا سکے۔

عبداللہ قطب شاہ کے دورِ حکومت کو مورخین "دورِ انتشار" کہتے ہیں۔ شاید اس سے ان کی مُراد سیاسی انتشار ہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اکبر کے عہد ہی سے دکن مغلوں کی نگاہ میں کھٹکنے لگا تھا۔ مغل سلطنت عہد بہ عہد دکن کو اپنا نشانہ بناتی رہی۔ اس کی لالچی نظریں ایک طرف دکن کو ہڑپ کر جانے کے راستے ڈھونڈ رہی تھی دوسری طرف اپنی طاقت اور شہنشاہی جلالت کو منوانے کے سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی لیکن یہ سارے مسائل دو بادشاہوں کے درمیان تھے اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ حدودِ سلطنتِ قطب شاہیہ کے باہر ہو رہا تھا۔ عوام امن دامان سے تھے ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ امیر غریب سب پیٹ بھر کھاتے تھے آرام سے میٹھی نیند سوتے تھے حدودِ سلطنت کے اندر اطمینان و سکون تھا۔ قومی ہم آہنگی تھی، ایک جیتی تھی شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ امرائے سلطنت متحد الخیال تھے۔ رعایا اپنے بادشاہ کو چاہتی تھی۔

علاّمہ کے عہد کے مشاہیر میں پہلا نام میر محمّد سعید کا آتا ہے۔ یہ شخص عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے بڑے امیروں میں سے تھا۔ علاّمہ کا ہم عصر تو تھا ہی لیکن جب سنہ ۱۰۵۹ھ میں علاّمہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اسی میر محمّد سعید کو عبداللہ قطب شاہ نے اپنا وزیر بنایا۔

میر محمّد سعید اصفہان کا رہنے والا تھا۔ بڑا بہادر اور بیدار مغز وزیر تھا۔ کسی کام

میں جدوجہد کرنے سے کبھی نہیں رُکتا تھا۔ اس کے عہد وزارت میں ملک حدود کی توسیع ہوئی اس نے حدود و سلطنت کو اپنی بہادری سے (۳۰۰) تین سو میل طویل اور ۴۰ میل عریض علاقہ تک پھیلا دیا۔ حکومت کو صرف اس علاقے سے چالیس لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ [۱]

میر محمد سعید میر جملگی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ سنہ ۱۰۶۳ھ تک جاری رہا۔ سنہ ۱۰۵۷ھ میں اس نے کندی کوٹہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور شاہ کی اجازت سے فوج لے کر حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ اس موقع پر مرزا سالک نے ایک قطعہ کہا تھا۔

اے خدیو سعید فرخ فال ؛ حافظت باد ایزد متعال

بہر اقبال فتح شد تاریخ ؛ روے آوردہ فتح با اقبال [۲] ۱۰۵۷

ترجمہ، اے سعید نیک خصال پروردگار عالم تیری حفاظت کرے کہ فتح کی تاریخ مقرر ہو چکی فتح و ظفر کا چہرہ تیرے سامنے آگیا۔

میر محمد سعید کو کندی کوٹہ کو فتح کرنے کے لیے تین سال جدوجہد کرنی پڑی بالآخر اس نے قلعہ کندی کوٹہ فتح کر لیا اس فتح کی خوشی کے موقع پر مرزا سالک نے یہ قطعہ کہا

کرد مفتوح باقبال تو کندی کوٹہ ؛ ہمچو خیبر کہ کشاد از کف فیاض وصی

از پئے فتح دلم خواست کہ گوید تاریخ ؛ فکر تاریخ مرا بردوز خود کردہ تہی

دوش در واقعہ دیدم کہ رسولی می گفت ؛ فاتح قلعہ علی بود علی بود علی [۳]

ترجمہ: تیرے اقبال نے کندی کوٹہ اسی طرح فتح کر لیا جس طرح (نبیؐ اطہر کے) وصی نے خیبر فتح کیا تھا میرے دل نے چاہا کہ اس فتح کی تاریخ لکھے میں اس تاریخ کی فکر میں اتنا کھو گیا کہ اپنا بھی خیال نہیں رہا۔ کل میں نے دیکھا کہ رسولؐ (مقبول) فرماتے ہیں کہ علیؑ فاتح قلعہ تھے علیؑ فاتح قلعہ تھے۔

میر محمد سعید کا وطن اصفہان تھا وہ سادات اردستان سے تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے سلطنت قطب شاہی کی خدمت کی اس کی مساعی نے سلطنت کے حدود میں بھی اضافہ کیا اور آمدنی میں بھی۔ میر محمد سعید نے جن علاقوں

کو فتح کیا تھا انہی میں الماس کی تین کانیں نکلیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے اِن میں سے دو کانوں (معدنوں) سے ہیرے نکلوانے کا کام بھی اسی کے سپرد کر دیا تھا ایک کان کرشنا کے قریب کولورد میں تھی۔ یہاں کی بستی کی آبادی ایک لاکھ تھی یہ لوگ کان کنی ہی کا کام کیا کرتے تھے۔

"دُنیا کا مشہور الماس کوہِ نُور جس کا وزن (۱۰۰) قراط تھا اسی معدن سے برآمد ہوا تھا۔"[۵]

دوسرا معدن بلاری میں تھا اس معدن سے بھی ثمرے بڑے ہیرے برآمد ہوئے تیسرا معدن بلولی میں تھا۔ اس کان سے ہیرے نکالنے کا کام ۱۰۸۰ھ میں شروع ہوا۔

میر محمد سعید میر جملہ نے گولکنڈہ میں بڑی دولت کمائی۔ اس نے اپنے یہاں کانی ہیرے جمع کئے تھے۔ اسی کی وجہ سے وہ گولکنڈے کے دولت مندترین لیڈروں میں سے تھا اس کی دولت کا اندازہ اس طرح کیجیے کہ شہنشاہ اکبر کے خزانہ میں جیسا کہ ابوالفضل نے اپنی تاریخ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "ہیروں کا مجموعی وزن ساڑھے پانچ ٹانک یعنی ایک سوتیس ۱۳۰ رتی ہوتا ہے۔ جب کہ میر جملہ میر محمد سعید نے اورنگ زیب کو اور شاہجہاں کو جو ہیرے نذر کئے تھے ان کا وزن گیارہ سو سولہ ۱۱۱۶ رتی تھا۔[۶]

میر جملہ میر محمد سعید نے حیدرآباد میں بہت سے محلات تعمیر کروائے تھے۔ لیکن اب ان کے آثار بھی نہیں پائے جاتے بقول طبا طبائی صحیح کہا ہے کہ

کھڑے ہوئے تھے امیروں کے جو بلند محل ؛ غرور اپنا دکھا کر زمیں پہ بیٹھ گئے !!

انہی میں سے ایک سعید آباد بھی ہے جس کو سعید اپیٹھ کہا جاتا تھا۔ سعید آباد آج کل ایک محلہ کا نام ہے۔ اس مقام کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہاں اورنگ زیب حیدرآباد پر حملہ کے وقت کوئی (۱۷) دن ٹھہرا تھا۔ اس نے مدراس کے قریب پونا پلی میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی جس کا ذکر اس کے سپہ سالار رستم بن ذوالفقار نے کیا ہے۔

میر جملہ نے نہ صرف محلات ہی تعمیر کروائے تھے بلکہ تلنگانہ میں مختلف مقامات پہ مختلف عمارتیں بھی تعمیر کروائی تھیں۔ ان کے علاوہ اس نے کئی باغ لگوائے اور

تالاب بنوائے تھے۔ میر محمد سعید اپنی زندگی کے آخری دور میں عبداللہ قطب شاہ کی سلطنت سے اپنا رشتہ توڑ کر شاہجہاں کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ اورنگ زیب کی مہمات میں جب تک زندہ رہا بڑی مدد کرتا رہا۔ ۱۰۷۳ھ میں کسی مہم سے واپس ہوتے ہوتے خضر پور کے مقام پر انتقال کر گیا۔ اس کے تفصیلی حالات ماثرالامرا اور مرزا طاہر نصرآبادی کے تذکرۃ الشعراء میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

نظام الدین احمد صاعدی شیرازی

نظام الدین احمد الصاعدی کا وطن شیراز تھا۔ اس کے باپ کا نام عبداللہ الصاعدی تھا اچھا شاعر تھا نظاما تخلص کرتا تھا۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی محفل کا آدمی تھا۔ شاہی دربار سے بھی متوسل تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آیا بڑا لائق آدمی تھا۔ حدیقۃ السلاطین جیسی مستند تاریخ اسی نے لکھی۔ یہ تاریخ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی ایما پر لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ خود نظام الدین نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

"بحسن تربیت وارشاد و یمن اصلاح و امداد نواب مستطاب ..... علامی فہامی شیخ محمد ادام اللہ ظلال ارشادہ کہ
زہوشیائی اصلاح او درست شدہ ؛ شکستہ کہ من از خامہ کردہ ام تحریر
زکیمیائی افادات او مس سخنم ؛ زرتمام عیاری شد و رولج پذیر
بترقیم و ترتیب سوانح و تحریر تفصیل مجملات وقائع قبل از جلوس ہمایوں کہ در خزانہ حافظ و گنجینۂ سینہ محفوظ ... داشت پرداخت۔"

ترجمہ: علامہ فہامی شیخ محمد ادام اللہ کے ارشاد و اصلاح و امداد سے کہ مرے قلم کی شکستہ تحریران (علامہ) کی اصلاح کی ہوشیاری سے درست ہوئی اور مس سخن (تانبہ) ان (علامہ) کی کیمیا سے افادات سے سونا ہوگیا۔ اس سوانح کو مرتب کیا گیا۔ واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا یہ واقعات قبل جلوس (عبداللہ)

السلاطین سے ہیں جو اس سینہ میں محفوظ تھے بیان کئے گئے ہیں۔

نظام الدین احمد صاعدی کی قابلیت وصلاحیت تو خود اس کی تصنیف حدیقۃ کے طرز تحریر ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے قابل ہونے کا دوسرا ثبوت علامہ علی اصغر بلگرامی نے اپنے مقدمہ میں یہ کہہ کر دے دیا ہے کہ

برفضیلت او ایں مقدار بس است کہ عضو حوزہ علمیہ نواب علامۃ الزماں الشیخ محمد بن خاتون العاملی قدس سرہٗ ہم بودہ [۸]

اس (نظام الدین) کی فضیلت کے لیے اتنا (کہنا) کافی ہے کہ وہ علامۃ الزماں شیخ محمد بن خاتون العاملی قدس سرہٗ کے حوزۂ علمیہ کا رکن تھا۔

اس تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا حوزۂ علمیہ کس علمی عظمت کا حامل تھا۔

بُرہان تبریزی

بُرہان شہر تبریز کا باشندہ تھا۔ اس نے علوم مروجہ کی تکمیل اپنے وطن ہی میں کی۔ اس کے باپ کا نام محمد حسین تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا۔ یوں تو تمام خانوادۂ قطب شاہیہ ماہرین علوم کی بڑی قدر کرتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ بھی عالموں اور دانشوروں کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ برہان تبریزی کی قابلیت سُنی تو دربار میں باریاب کیا۔ وہ ایک "مُدت تک علامہ شمس الدین محمد بن خاتون کے خدمیوں میں شامل رہا۔"

بُرہان تبریزی عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت کے ان تین لغت نویسوں میں سے ایک ہے جنھوں نے لغت نویسی کے فن کے اصول مرتب کیے۔ وہ فارسی زبان کا ماہر تھا۔ اس نے "بُرہان قاطع" کے نام سے لغت کی تدوین کی۔ یہ بڑی مشہور لغت ہے۔ یہ لغت سنہ ۱۰۶۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس نے تاریخ تکمیل ایک قطعہ میں اس طرح بیان کی ہے۔

چو بُرہان از رہ توفیق یزداں ⁂ مرایں مجموعہ را گردید جامع
پئے تاریخ اتمامش قضا گفت ⁂ کتاب نافع برہان قاطع ۱۰۶۲ھ

پروردگار عالم کی توفیق (شامل حال تھی) کہ یہ جامع مجموعہ مکمل ہوا۔ قدرت نے اس کے اتمام کی تاریخ بیان کی کہ یہ نفع (دینے والی) کتاب بُرہان قاطع ہے۔

اس قطعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے

یہ لغت (۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس نے ہر باب کا نام "دفتر" رکھا ہے لغت کے دیباچہ میں عبداللہ قطب شاہ کا ذکر بزبان شعر اس طرح کیا ہے۔

شہے کہ در صف شاہان ہند ممتاز است ⁂ چو در میانۂ یاراں علی ولی اللہ

ہندوستان کے بادشاہوں میں (یہ) بادشا (اس طرح) ممتاز ہے جس طرح اصحاب رسولؐ کے درمیان علی ولی اللہ (ممتاز) ہیں [۹]

بُرہان قاطع کی مختلف ادوار میں طبع ہونے کی تفصیل حکیم شمس اللہ قادری اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

"بُرہان قاطع اگرچہ اغلاط سے مبرا نہیں ہے باوجود اس کے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور روم میں بھی اس کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس کو سب سے پہلے کپتان روبک ۔۔۔ بمتعدد علما کی امداد سے تصحیح کر کے ۱۲۳۳ھ میں کلکتہ سے چھپوایا۔ اس کے بعد ۱۲۳۸ھ ۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۲ھ میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ ایرانیوں نے بمبئی میں اس کو کئی بار طبع کرایا۔۔۔۔ لکھنؤ اور کانپور میں اس کے کم از کم چھ ایڈیشن طبع ہوئے۔ ان میں سب سے قدیم لکھنؤ کے مطبع علوی کا نسخہ ہے جو ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں پہلی بار ۱۲۸۸ھ دوسری بار ۱۲۹۶ھ اور تیسری مرتبہ ۱۳۰۶ھ میں اس کی طباعت ہوئی۔ [۱۰]

سید احمد عاصمی نے "تبیان نافع ترجمہ بُرہان قاطع" کے نام سے ترکی میں اس لغت کا ترجمہ کیا۔ یہ شخص انقرہ میں مکتب سلطانی کا مدرس تھا۔ یہ ترجمہ

بڑی نفاست کے ساتھ طبع ہوا۔ اس کا سنہ طباعت ۱۲۲۴ھ ہے۔ قسطنطنیہ کے مطبع عامرہ میں چھپی۔ مصر میں بھی اس کے دو ایڈیشن سنہ ۱۲۵۱ھ اور ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوئے [۱۱]۔ اس تفصیل سے بُرہان قاطع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اسی کے ساتھ نہ صرف علامہ کے "حوزۂ علمیہ" کے دانشوروں، ان کے ندیموں اور اس ادارۂ علمی سے نسبت رکھنے والوں کی علمی قدو قامت سے ہم واقف ہو جاتے ہیں بلکہ خود علامہ کی علمی عظمت سے بھی ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کا دوسرا لغت نویس محمد علی ہے۔ اصفہان کے قریب جبل رود کا رہنے والا تھا۔ آدمی بہت لائق تھا۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اس کے گولکنڈہ میں موجودگی کا سنہ ۱۰۵۴ لکھا ہے [۱۲] لیکن یہ سنہ درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ محمد علی نے خود اپنے گولکنڈہ آنے کا سنہ ۱۰۴۹ھ بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"وجود محمد علی جبل رودی گوشہ نشین دیار بے دیار......

بسمع ارباب دانش وبینش میرساند کہ بتاریخ سال ہزار و چہل و نُہ ہجری گذار این بندہ بے دیار گولکنڈہ افتاد [۱۳]

ترجمہ: دیار بے دیار کا ایک گوشہ نشین محمد علی جبل رودی ارباب دانش کی (خدمت میں) عرض رساں ہے کہ یہ بندہ بے دیار سنہ ۱۰۴۹ میں گولکنڈہ میں تھا۔

اس نے اس "جنت آباد" (حیدرآباد) میں "افضل المحققین" ہادی فروع و اصول جامع معقول و منقول "دانا بے رموز" "شیخ الاسلام محمد الخاتون" "مدرس علما" کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا یعنی وہ علامہ کے محفل علم میں شامل ہو گیا۔

اس نے اپنے لغت کی تحریک کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دن علامہ کی محفل میں یہ ذکر آیا کہ شاہ عباس صفوی نے ترکی زبان کے ضرب الامثال جمع کروائے لیکن فارسی زبان کے ضرب الامثال آج تک کسی نے جمع نہیں کیے۔ علامہ نے یہ کام محمد علی کے سپرد کیا۔ اس نے علامہ کی فرمائش بلکہ حکم کی تعمیل کی اس سلسلہ میں اس کو کافی دقت بھی

اُٹھانی پڑی۔ اس کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی بہت شکنی بھی کی گئی۔ لیکن اس نے کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام کی تکمیل کی ان ضرب الامثال کو حروف تہجی میں ترتیب دیا ہے اور ہر ضرب المثل کی مناسب تشریح کی ہے۔ اس مخطوطہ کی نقلیں مختلف کتب خانوں میں ہیں اور ہر جگہ اس کے نام بھی مختلف ہیں۔ کہیں "جامع التماثیل" ہے کہیں "عجایب الامثال" اور کہیں مجمع الامثال ہے یہ کتاب ۱۲۶۸ھ میں طہران میں اور ۱۳۰۹ھ میں بمبئی میں شائع ہو چکی ہے[۴] ادارۂ ادبیات اُردو کے مخطوطہ میں جو نام ہے وہ "مجمع الامثال" ہے جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے:

"بعد از جمع و تالیف این امثال ترتیب آنرا بر حروف تہجی نہاد بست و ہشت فصل قرار داد این مجموعہ را مجموع الامثال نام نہاد۔[۵]

ترجمہ: ان ضرب الامثال کو جمع اور تالیف کرنے کے بعد ان کو حروف تہجی میں مُرتب کیا اس کی ۲۸ فصلیں قرار دیں اور اس مجموعہ کا نام مجموع الامثال رکھا"

یہ مختصر سی لغت دل چسپ ہے کم و بیش سارے امثال آج بھی رائج ہیں جیسے اول نماز بعد نیاز، اول طعام بعد کلام، آں قدح بشکست و آں ساقی نماند وغیرہ اس میں تشریح کے دوران بعض دل چسپ تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں۔

سیّد نظام الدین احمد بن سیّد معصوم الدشتکی شیرازی عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔ اسی کے عہد میں مکہ معظمہ سے آیا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ بہت لائق شخص تھا۔ سیّد نظام الدین کی حیدرآباد آنے کی ایک وجہ تھی۔ وہ آیا نہیں تھا بلکہ بلوایا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سیّد نظام الدین نسلاً بھی اور علم و فضل کے اعتبار سے بھی بے شک فضیلت مآب تھا اس کے دادا سیّد غیاث الدین منصور ایران کے جیّد علماء میں سے تھے۔ لوگ ان کو استاد البشر کہا کرتے تھے۔ انہوں نے شیراز کے محلہ دشتک میں "مدرسہ منصوریہ" نام سے ایک مدرسہ کھولا تھا جس میں وہ خود علم معقول و منقول کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کا لڑکا سیّد معصوم شاہ عباس صفوی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے حج کا ارادہ کیا تو شاہ عباس نے اپنی بہن کو اس کے ہمراہ کر دیا۔ سیّد معصوم نے مکہ میں بادشاہ کی بہن سے

شادی کرلی۔ چونکہ یہ شادی شاہ کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اس لئے اب سید منصور کے ایران آنے کا سوال ہی نہیں تھا چنانچہ اس نے مکہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

سید نظام الدین دشتکی مکہ ہی میں پیدا ہوا اور یہیں اس نے علم و فضل میں بڑا کمال حاصل کیا۔ میر محمد سعید میر جملہ [جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے] نے اس کے علم و فضل سے متاثر ہو کر گولکنڈہ بلوایا اور اپنی لڑکی سے شادی کرنا چاہی۔ جب سید نظام الدین دشتکی حیدرآباد آیا اور عبداللہ قطب شاہ کو اس کے علم و فضل کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے نظام الدین کو اپنا داماد بنا لیا۔

عبداللہ قطب شاہ کا انتقال محرم ۱۰۸۳ھ میں ہوا۔ اس کے انتقال کے دو سال ۲۳ دن کے بعد نظام الدین کا انتقال ہو گیا۔ اس کو لنگر فیض اثر میں ایک نیم تعمیر گنبد میں دفن کیا گیا۔ اس کے کتبۂ مزار پر تاریخ وفات اس طرح لکھی ہے:

مرزا نظام الدین احمد نور مرقدہ بتاریخ ۲۶ شہر صفر روز سہ شنبہ سنہ ۱۰۸۵ھ بعد از سہ پہر چہار گری برحمت پیوست۔ [۱۶]

میر محمد کاظم حسینی کریم | یہ ایک غیر معروف شاعر تھا لیکن بڑا قادر الکلام تھا عراقی سید تھا پہلے وہ ہندوستان آیا۔ وہاں سے یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آ گیا۔ قطب شاہی دربار سے متوسل ہوا۔ اس نے عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے۔ "عشرہ مبشرہ" کے نام سے اس نے دس مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ وہ ایک اچھا رباعی گو شاعر بھی تھا اس نے چار ہزار رباعیاں کہی تھیں۔ اس رباعی سے اس کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ہر مصرع دیباچہ مستانہ من ٭ ہر بیت راز دل دیوانہ من
دیباچہ کریم بر رباعیات من ٭ گنجی ست کہ باشد بویرانہ من

ترجمہ: ہر مصرع مجھ مست و بے خود کا دیباچہ ہے (اس کا) ہر بیت مجھ دیوانہ کا رازِ دل ہے کریم کی رباعیات کا دیباچہ دراصل ایک خزانہ (علم) ہے جو میرے ویرانہ میں ہے۔

کریم جتنا زبردست مثنوی قصیدہ رباعیات گو شاعر تھا۔ گنج نامہ عبداللہ قطب شاہ کے نام پر لکھا گیا ہے اس میں بادشاہ کے لئے پہلے عدل و انصاف کے احکام اور

طرزِ حکمرانی کی تعلیم ہے اس نے عبداللہ قطب شاہ کو نصیحت کی ہے کہ وہ عدل و انصاف سے کام لے۔

کریم کی اور بھی کتابیں ہیں جو عبداللہ قطب شاہ کے نام پر ہی ہیں۔ ان کتابوں کے نام نہیں ہیں یعنی مصنف نے ان کتابوں کے کوئی نام نہیں رکھے ہیں کتابیں نظم و نثر پر مشتمل ہیں ان میں سے جو نظم والی کتاب ہے وہ غالباً مثنوی ہے عبداللہ قطب شاہ کی تعریف اس طرح کرتا ہے

بادگلِ دولتِ عبداللہی ؛ زیب دہ گلشنِ شاہنشہی

گلزار شہنشاہیت کی زینت عبداللہ کی سلطنت کے گلاب سدا کھلکھلاتے رہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں قصیدہ بھی کہا ہے اسی قصیدے میں اس کے طرزِ حکمرانی پر تنقید بھی ہے۔ بعض ناانصافیوں اور اپنے وظیفہ کو کم کر دیئے جانے کی شکایت بھی ہے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر ناانصافیوں کو دور نہیں کیا گیا اور عدل و انصاف کو بحال نہیں کیا گیا تو وہ اپنے وطن واپس چلا جائے گا۔ اس نے اپنے اشعار کو موثر بنانے کے لیے دوسرے فارسی اساتذہ جیسے نظامی سعدی وغیرہ کے اشعار بھی اپنے اشعار سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس نے قصیدے کی ابتداء ہی عجیب انداز سے کی ہے کہتا ہے۔

گنج باشد عدل و رحمت ظلم و بدعت مارِ آں ؛ مار را چوں سر بکوبی می بری گنج از میاں

عدل و رحمت کا خزانہ ہے اس (خزانہ) پر ظلم و بدعت کے سانپ بیٹھے ہیں جب سانپ کا سر کچل دیا جاتا ہے تو خزانہ برآمد ہوتا ہے۔

عبداللہ امانی | عبداللہ امانی بھی اسی دور کا ایک غیر معروف شاعر تھا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آیا تھا۔ اس نے بارہ اماموں کی مدح میں منقبتیں کہی ہیں۔ ان کے علاوہ غزل قطعات ترکیب بند اور ترجیع بند کہے ہیں۔ اس نے خود ۱۰۴۷ھ میں اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ دیوان میں دو مثنویاں بھی ہیں، مثنوی کی زبان اگرچہ آسان ہوتی ہے پھر بھی اس کی مثنوی کے اس ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی سہل الممتنع میں شعر کہتا ہے۔

خداوندا تو ستار عیوبی ❊ قسیم رزق و غفار ذنوبی کے

اے پروردگار تو عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے تو ہی رزق بانٹتا ہے اور گناہوں کو بخشتا ہے۔

الفتی ساوجی علامہ کے عہد ہی میں حیدرآباد آیا اس کے باپ کا نام محمد حسین تھا۔ ادب اور ریاضی کا ماہر تھا۔ عبداللہ قطب شاہ اہلِ علم کا سرپرست تھا۔ الفتی بہت جلد دربار شاہی سے متوسل ہوگیا۔ الفتی بڑا ظریف اور بذلہ سنج تھا۔ اس کی فطرت میں ظرافت اور شگفتہ مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو کوئی ایک مرتبہ اس سے ملتا بس اسی کا ہو جاتا۔ شہر کے سارے اکابرین اور عمائدین سلطنت الفتی کو بہت دوست رکھتے تھے۔ یہ شخص بڑا انسان دوست اور ہر ایک کا ہمدرد تھا۔ اسی لیے اس کے گھر پر حاجت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ الفتی کے پاس "نہیں" کا لفظ ہی نہیں تھا۔ سفارش کرنے میں بہت مشہور تھا اس نے بڑی طویل عمر پائی۔ ابوالحسن کے عہد میں اس نے انتقال کیا اور دائرہ میر مومنؒ میں دفن کیا گیا۔

عبداللہ قطب شاہ نے الفتی سے اپنے عہد کی منظوم تاریخ لکھنے کی خواہش کی تھی چنانچہ اس نے "روائح گلشن" کے نام سے عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی منظوم تاریخ لکھی اس کو سات روائح میں تقسیم کیا رائحہ اول میں بادشاہ کے اخلاق رائحہ دوم میں عمارات رائحہ سوم میں شہر کی آبادی رائحہ چہارم میں سرکاری جشنوں کا ذکر رائحہ پنجم میں فوج کا ذکر رائحہ ششم میں مختلف مسائل رائحہ ہفتم میں سبب تالیف۔ الفتی بڑا پر گو شاعر تھا۔ اس کا لب لہجہ شیریں بھی ہے اور شگفتہ بھی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی مدح کے ایک قصیدے کے ان شعروں کو دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ الفتی کس قدر شیریں سخن تھا۔

بہار فیض ازل قطب شاہ عبداللہ ❊ کہ یافت نشاء عدلش سر تلنگانہ

لبالب از می مہر علیؑ و آل شد است ❊ بدور دولت او ساغر تلنگانہ

عبداللہ قطب شاہ فیض خداوندی کی بہار ہے اسی کے عدل سے سر تلنگانہ نشہ سے سرشار ہے ساغر تلنگانہ اس کے دورِ حکومت میں شرابِ محبت علیؑ و اولاد علیؑ سے

(بھرا ہوا ہے) چھلک رہا ہے۔

الفتی اچھا نظم گو شاعر بھی تھا۔ اس نے محلوں وغیرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں کمان شیر دل (کمان سحر باطل) پر اس کی نظم کے یہ دو شعر دیکھیئے:

زہے شان دروازۂ شیر دل : کہ از رفعتش کردہ گردوں خجل

بہ این آستاں تا شود سرفراز : سجود آورد مہر با صد نیاز

(کمان) شیر دل کے دروازے کی عجب شان ہے کہ اس کی بلندی سے آسمان شرمندہ ہے اس آستاں کی سرفرازیاں کیا بیاں ہوں کہ آفتاب (بہایت) انکسار کے ساتھ سر بہ سجدہ ہے ـــــ الفتی نے فن شعر پر بھی ایک رسالہ "ریاض الصنایع قطب شاہی" لکھا اور اس کو بادشاہ سے انتساب کیا۔ اس رسالہ میں عروض، قافیہ، صنائع بدائع وغیرہ پر بحث کی گئی ہے یہ رسالہ ۱۰۴۸ھ میں مکمل ہوا۔ تکمیل پر یہ قطعہ تاریخ کہا گیا ۱۸ے

ریاض الصنایع چو اتمام یافت : بہ اعداد توفیق پروردگار

طلب کردم از کلک تاریخ او : رقم زد چہل ہشت و سال ہزار

۱۰۴۸ھ

سید احمد: اس شخصیت کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی لیکن وہ قابلِ ذکر ضرور ہے۔ سید احمد ماہر لسانیات تھا۔ عربی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔ علم ریاضی سے اس کو عشق تھا۔ جب کبھی کوئی ماہر ریاضیات حیدرآباد آتا تو سید احمد اس کی خوب مہمان داری کرتا۔ مشہور ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں ایک ماہر ریاضی عیسائی پادری حیدرآباد آیا۔ سید احمد نے اس کو اپنے یہاں مہمان رکھا خوب آؤ بھگت کی۔ اس سے خواہش کی کہ وہ حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلے لیکن اس پادری کے معذرت چاہی۔ اس پر سید احمد نے اس کے سفر خرچ کے لئے تین سو ہن دیئے تحفہ میں قیمتی خلعت دیا اور مچھلی پٹنم تک سواری کا انتظام کردیا اور سفر میں سہولت کے لیئے دو رہبر بھی ساتھ کردیئے۔ ۱۹ے

مرزا رضا قلی بیگ نیک نام خاں

مرزا رضا قلی بیگ مورخین کے درمیان اپنے اصلی نام سے کم نیک نام خان کے خطاب سے زیادہ معروف ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے وفادار و نیک نام سپہ سالاروں میں سے تھا۔ اس کا اصلی وطن ایران تھا۔ شجاعت و بہادری کے اوصاف کے ساتھ ساتھ صاحب فضل و کمال بھی تھا۔ دانشوروں، عالموں اور ماہرِ فنون کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اگر کوئی اس کے زیرِ سرپرستی آتا تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر علما اور فضلا اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ نیک نام خان، عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے ذی وجاہت امرا میں سے ایک تھا۔ ایران میں شاہ عباس صفوی کے دربار سے وابستہ تھا۔ صاحب بساتین السلاطین اور صاحب منتخب اللباب خافی خان نے اس امر کی بڑی تعریف کی ہے۔ خافی خان نے نیک نام خان کے ایران چھوڑنے کا عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے۔ شاہ عباس ثانی نے ایک دن ضرورت سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اس نے نشہ میں دھت ہو کر اپنے سارے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اسی حالت نشہ میں اس نے اپنی منظور نظر کنیز کو مرزا رضا قلی بیگ نیک نام خان کے یہاں بھیج دیا۔ جب نشہ کافور ہو گیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا حرکت کی۔ نیک نام خان انجام سے واقف تھا اس نے اپنے کو خصی کرا لیا۔ جب بادشاہ کو اس کا یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے نیک نام خان کی جان بخشی کر دی ایسے بہادر آدمی کے لیئے اب ایران تنگ ہو گیا وہ ذہنی طور پر ایران سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ وہ ترکِ وطن کر کے سیدھے حیدرآباد چلا آیا۔ حیدرآباد تو باصلاحیت شخصیتوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ یہاں آتے ہی دربار سے متوسل ہوا اور بہت جلد عبداللہ قطب شاہ مقرب خاص بن گیا۔

نیک نام خان حیدرآباد میں زندگی کی آخری سانس تک نیک نام رہا۔ اس کی بہادری اور علمی سرپرستی دونوں ہی حیدرآبادیوں کے زبان زد تھے۔ مغل سپہ سالار جے سنگھ نے جب بیجاپور حملہ کیا تھا تو عبداللہ قطب شاہ نے نیک نام خان کو

بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادہ فوج کا سپہ سالار بناکر عادل شاہ کی مدد کے لئے بیجاپور روانہ کیا تھا۔ اسی طرح علمی میدان میں بھی وہ علماء کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہا علی بن طیفور بسطامی صاحب حدائق السلاطین جیسی قابل شخصیت کو نیک نام خان ہی ایران سے اپنے حیدرآباد لے آیا تھا۔

نیک نام خان کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ ہوا اس کو ابراہیم قلی قطب شاہ کی گنبد والے چبوترے کے شمالی رُخ پر دفن کیا گیا اور قبر کے اطراف ایک چوکھنڈی بنادی گئی لوح مزار پر ابوالحسن تانا شاہ کے فرمان کندہ ہے جس میں خادموں، حافظوں روشنی اور لنگر کے اخراجات کی پابجائی کے لئے ایک موضوع متگلوار م وقف کیا گیا ہے۔ اس فرمان سے نیک نام خان کے رُتبہ کی بلندی معلوم ہوتی ہے۔

علی بن طیفور عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی اہم شخصیت ہے۔ علی بن طیفور مکہ معظم میں پیدا ہوا وہیں پرورش پر داخت ہوئی علوم مروجہ کی تکمیل بھی اس نے مکہ معظمہ میں کی۔ علی کا باپ طیفور بن محمد بڑا جید عالم تھا۔ اس کا شمار مُستند مُفسروں اور محدثوں میں ہوتا ہے۔ اس نے کُتب احادیث سے اخلاق پر منتخب و مُستند حدیثیں جمع کر کے "مجموعہ طیفور بن محمد البطامی" کے نام سے ایک کتاب الاخلاق مرتب کی۔ ان احادیث کا بڑا ماخذ و مدرک شیخ صدوق ابی جعفر محمد بن محمد بن بابویہ قمی کی کتب "کتاب الخصائل"، کتاب العلل اور کتاب العیون ... ہیں۔ ایران میں علی بن طیفور کے استاد شیخ رضی الدین محمد الحسینی التفرشی تھے۔ اور دکن میں علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ تھے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف حدائق السلاطین میں بہت ہی کھل کر اس حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے:

راقم الحروف بنسبت بہ آنحضرت (علامہ ابن خاتون) علاقہ بندگی دارد و بزبان گستاخی خود را در سلک شاگردانش می شمارد،

اگر خواہم کہ باشد آبرویم ؛ ہمیں گویم کہ من شاگرد اویم
نہ شاگردم غلام کمترینم ؛ بگرد خرقہ دنی خوشہ چینم

راقم الحروف کو اُن حضرت (علامہ ابن خاتون) سے جو نسبت ہے وہ

بندگی کی نسبت ہے یہ گستاخی ضرور ہے کہ میں اپنے کو ان کے شاگردوں
میں شمار کرتا ہوں اگر میں اپنی آبرو چاہتا ہوں تو میں بھی یہی کہوں کہ ان
کا شاگرد ہوں شاگرد نہیں ہوں (بلکہ) غلام کمترین و بے بضاعت ہوں۔
اسی شخصیت کے اطراف گھوم کر خوشہ چینی کرتا ہوں یعنی استفادہ کرتا ہوں
یہ بیان ایک ایسے دانشور کا ہے جس نے عربی و فارسی لسانیات میں دستگاہ حاصل
کی تھی علی بن طیفور (۹) کتابوں کا مولف و مصنف ہے۔ اس بیان سے علامہ کی قد آور
شخصیت کی عظمت معلوم ہوئی ہے۔

(۱) عیون اخبار الرضا: شیعوں کے آٹھویں امام علی ابن موسیٰ علیہ السلام کی مدح میں عربی قصائد ہیں علی بن طیفور نے ان کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۲) تحفہ قطب شاہی: عبداللہ قطب شاہ کی ایما اور فرمائش پر گلستان کے طرز پر لکھی گئی اس کتاب میں دراصل بادشاہوں کا دستور العمل ہے۔ جو شجاعت، عدالت، سخاوت، مشاورت، سیاست حلم و عفو شفقت و مرحمت نصیحت و وصیت جیسے موضوعات کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔

(۳) شرح عوامل: عربی کتاب کا فارسی شرح ہے اس کا مصنف ابوبکر بن عبدالرحمن ہے۔

(۴) ترجمہ مکارم الاخلاق: مجمع البیان مولف رضی الدین ابی نصر حسن بن فضل طوسی کا ترجمہ ہے (۵) انوار التحقیق: وعظ و نصیحت اس کا موضوع ہے یہ بھی عبداللہ قطب شاہ کے کہنے پر لکھی گئی۔

(۶) گنج نامہ: شاہنامہ کی فرہنگ ہے مشکل لفظوں، تلمیحوں اور محاوروں کی مبسوط تشریح ہے۔ بہت ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب علی بن طیفور نے مرزا رضا علی بیگ المخاطب بہ نیک نام خان کی فرمائش پر لکھی ہے۔

(۷) تحفۃ الغرایب: اس کا موضوع روح نفس اور عقل ہے۔

(۸) رسالہ معصومیہ: اس کا موضوع حیات بعد الموت ہے۔

(۹) حل الیق السلاطین: یہ اس مولف کی آخری کتاب ہے جو اس نے سنہ ۱۰۹۲ھ

میں لکھی ہے اس میں منجملہ اور بادشاہوں ان کے امیروں کے شاہان قطب شاہیہ اور ان کے بعض قابلِ ذکر امرا کا تذکرہ ہے۔[۲۱]

عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے بعض اطبا بھی قابلِ ذکر ہیں جیسے حکیم جبرئیل حکیم پیٹر ڈی لان، حکیم اسماعیل، حکیم عبدالجبار گیلانی اور حکیم نظام الدین وغیرہ۔ حکیم پیٹر ڈی لان اس لیئے قابلِ ذکر ہے کہ یہ ایک اچھا فصّاد تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کو ایک مرتبہ دردِ سر کی شکایت ہوئی۔ اس نے زبان کے نیچے فصد کھول کر بادشاہ کے دردِ سر کا علاج کیا۔ اس صحت یابی نے اس کے رسوخ کو عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں بہت بڑھا دیا۔ اس کی تنخواہ ۸ سو ہن تھی۔ اس کو عمل جراحی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ حکیم اسماعیل بھی تجربہ کار درباری حکیم تھا۔ زیادہ تر امرا نے دربار کا علاج کیا کرتا تھا۔

حکیم عبدالجبار گیلانی عبدالجبار فنِ حکمت میں مہارت ضرور رکھتا تھا لیکن اس کی فطری دلچسپی انشاء میں تھی۔ چنانچہ وہ محکمہ دارالانشاء کا صدر بنایا گیا۔ شاہی فرامین بھی وہی لکھا کرتا تھا۔ حکیم عبدالجبار کو قدرت ایک خاص نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ اِسے نہایت سریلا گلا ملا تھا۔ اسی لئے شاہی مجلسیں پڑھنے کا فرض بھی اِسی کے ذمّہ تھا۔ عبدالجبار کا کچھ ذکر پہلے کے صفحات میں بھی آچکا ہے۔

حکیم نظام الدین احمد حکیم نظام الدین احمد بہت حاذق حکیم تھا۔ حکمت کے فن کے علاوہ دوسرے علوم متداولہ و مروجہ میں بھی کافی دستگاہ حاصل کی تھی وہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی اور شمس الدین میر باقر داماد جیسے عظیم المرتبت اساتذہ کا شاگرد تھا۔ میر باقر داماد سے علم فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایران سے ہندوستان آیا تو مغل فوج کے سپہ سالار مہابت خاں کا درباری بنا۔ وہ مہابت خاں کا ندیم تھا۔ سفر و حضر میں مہابت خاں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مہابت خاں جس زمانہ میں دکن کی مہم پر تھا تو حکیم نظام الدین بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی ملازمت کا یہ ساتواں سال تھا۔ مہابت خاں کا دکن کی مہم کے دوران

۱۰۴۲ھ میں انتقال ہوگیا۔ نظام الدین کو شاید یہ خیال ہوا ہو کہ اب اس کی ایسی سرپرستی کسی اور سے نہ ہوسکے گی اس لئے وطن لوٹ جانے کا ارادہ کیا۔ اس عرصہ میں علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے ذریعہ عبداللہ قطب شاہ کو اس کی قابلیت کا حال معلوم ہوا تو بادشاہ نے اس کو حیدرآباد بلوایا اس کی بڑی عزت و توقیر کی گئی۔ عبداللہ قطب شاہ نے حکیم الملک کا خطاب دیا اور چھ ہزار تنخواہ مقرر کی اور شاہی حکیم سے معزز کیا اور ایسی قدردانی کی کہ حکیم الملک اپنا وطن بھول گیا اور حیدرآباد ہی کو اس نے اپنا وطن بنالیا۔ کوئی ۳۸ سال یہاں بسر کئے یہیں پیوند خاک ہوا۔

۱۰۵۴ھ میں وہ قطب شاہی سلطنت کے سفیر کی حیثیت سے ایران بھی گیا تھا۔ یہ شاہ عباس ثانی کا دور تھا۔ ایران سے واپسی کے دوران گیلان کے راستے پر ایک پل تعمیر کروایا اس پر (۹) اشعار کا ایک قطعہ کندہ کرواکے لگوایا اس کے چند شعر یہ ہیں:

بعہد شاہ عبداللہ جم جاہ ؛ سلیمان دکن آن شاہ بن شاہ
حکیم الملک آن خورشید دانش ؛ کہ شد روشن ز رویش چشم بینش
بعہد دولت عباس ثانی ؛ چراغ محفل صاحب قرانی
پئے فرمودن دریائے احسان ؛ ز روئے مکرمت در راہ گیلان
شد این مصرع تاریخش مناسب ؛ پل خیر حکیم الملک حاجب ۱۰۵۵ھ

ترجمہ: سلیمان دکن سلطان ابن سلطان بادشاہ جم جاہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس خورشید دانش کے حکیم الملک نے جس کے چہرے کی روشنی سے نگاہیں روشن ہیں عباس ثانی دور میں اس حکم سے گیلان راستہ میں پل تعمیر کروایا اس کا مصرع تاریخ ہے "پل خیر حکم الملک حاجب"۔

میر محمد سعید میر جملہ کی ہیروں کے معاملہ میں بد دیانتی نے عبداللہ قطب شاہ کو اس سے بے حد ناراض کردیا۔ میر جملہ فوراً مغلوں سے مل گیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کے بیٹے محمد امین کو قید کردیا۔ میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب نے اپنے بیٹے شہزادہ سلطان محمد کو حیدرآباد پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سلطان محمد نے حیدرآباد

پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے مصالحتی گفتگو کے لئے حکیم الملک کو بھیجا۔ سلطان محمد نے اس کو فوراً قید کر لیا۔ اور اس وقت رہا کیا جب عبداللہ قطب شاہ نے محمد امین کو رہا کر دیا۔

حکیم الملک نے لنگر فیض اثر کے قریب ایک بستی آباد کی تھی اس بستی کا نام حکیم پیٹھ ہے۔ حکیم الملک نظام الدین نے کوئی (۲۱) کتابیں تالیف کیں جن میں چند کتابیں یہ ہیں جنھوں نے زیادہ شہرت حاصل کی۔

[۱] تلخیص معالجات بقراط [۲] تلخیص ربیع الابرار [۳] عجائب الانوار [۴] رسالہ احوال شیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا (المعروف بہ حکیم ابن سینا) [۵] شیخ الرئیس کی مشہور کتاب قانون۔ اس نے شجرۂ دانش کے نام سے عبداللہ قطب شاہ کے نام عربی میں خطبہ لکھا۔ اور اشارات کی فہرست مرتب کی۔ اشارات بھی شیخ الرئیس بوعلی سینا کی کتاب "قانون" کی طرح مشہور تصنیف ہے۔

ذوالفقار بن آذر ساسانی

مشہور تذکرہ نویس ہے۔ "دلبستان" اس کا تذکرہ ہے جو مستند تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں دو مرتبہ آیا علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ تیسری مرتبہ آیا تو کئی برس یہاں رہا۔

سعید کاشانی سرمد

یہ ایک رباعی گو شاعر تھا۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ سے قریبی ربط تھا علامہ اس کو پسند بھی کرتے تھے۔ ذوالفقار بن آذر صاحب تذکرہ دلبستان کا کہنا ہے کہ سعید کاشانی یہودی النسل تھا۔ اس نے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اسلام قبول کیا سعید کاشانی کوئی معمولی قابلیت کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنے دور کے اسلامی فلسفہ کے عظیم اساتذہ ابوالقاسم فندرسکی اور ملا صدرالدین شیرازی المعروف بہ ملا صدرہ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ بڑا مضبوط شاعر تھا۔ سرمد نے شاید کچھ مقامات کشف بھی پا لئے تھے۔ اسی سرمد نے علامہ کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر کہا تھا کہ علامہ عنقریب سفر آخرت کرنے والے ہیں۔ اسی سال علامہ حج کے لئے روانہ ہوتے اور بندرگاہ مخا پہنچ کر

انتقال کیا۔ سراج الدین علی خان آرزو نے بھی اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں اس کا ذکر کیا ہے۔

سالک یزدی | عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت کا بڑا شاعر تھا۔ سالک علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے دربار سے وابستہ رہا مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اس نے قصائد بھی کہے ہیں۔

خلقی شوستری | طب کے فن میں بڑا کمال رکھتا تھا۔ ۹۹۸ھ میں محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں بھی حیدرآباد آیا تھا لیکن واپس چلا گیا پھر ۱۰۲۳ھ میں محمد قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آیا اور یہیں رہ گیا۔ خلقی شوستری مدرسۂ دارالشفاء میں طب کی تعلیم دیتا تھا۔ واضح رہے کہ دارالشفاء وہ عوامی دواخانہ تھا جہاں نہ صرف مریضوں کا علاج ہوتا تھا بلکہ وہ طبیہ کالج بھی تھا یہاں طب پر تحقیقاتی کام بھی ہوتا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اسے اپنے درباریوں میں شامل کیا اور کتابوں کی تصحیح کا کام اس کے سپرد کیا۔

حکیم شمس اللہ قادری صاحب مآثر قطب شاہیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں عربی زبان کے ادبا اور شعراء کی خوب قدر و منزلت ہوا کرتی تھی اور ان کو گراں بہا انعام و عطایا سرفراز ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے عرب و عجم کے اکثر کاملانِ فن دربارِ قطب شاہی میں جمع ہو گئے تھے۔ اور اس زمانہ میں شہر حیدرآباد سارے ہندوستان میں عربی ادب اور شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا۔"

سچ پوچھئے تو حقیقت یہی ہے کہ متذکرہ بالا مشاہیر کسی نہ کسی طرح علامہ کے خوانِ کرم سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ علامہ پیشوائے سلطنت تھے اور یہاں کی تہذیب کو ایک خاص رنگ دینا چاہتے تھے اس کے لئے ان ذہنوں کو حیدرآباد میں جمع کرنا ضروری تھا جو ان کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں ان کی مدد کر سکیں یا پھر ان میں ایسے بھی تھے جو اپنے وطن کے حالات سے متاثر ہو کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور انھیں سلطنتِ قطب شاہیہ میں پناہ ملنے کا یقین تھا اپنے وطن سے اٹھے اور سیدھے حیدرآباد چلے آئے۔ علامہ نے بھی حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی طرح

قابل شخصیتوں کی سرپرستی میں کبھی کوتاہی نہیں کی. جس میں جیسی صلاحیت دیکھی اسے وہ مقام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد پیشوائی میں حکومت کے سارے کل پرزے اپنے اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انداز میں انجام دے رہے تھے سماجی کاموں خصوصاً علوم کی نشر و اشاعت میں ان سے وابستہ شخصیتیں لیں تن دہی کے ساتھ علامہ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں مولانا ادیس نے تیس سال فقہ پڑھائی ہے اور یہ فرض علامہ علیہ الرحمہ کی ایما پر ہی انجام دیا۔

باب (۶) حوالے

۱:	حکیم شمس اللہ قادری	ماثر قطب شاہیہ	ص۹	خانگی کتب خانہ
۲:	〃 〃	〃	ص۶۶	〃
۳:	〃 〃	〃	ص۶۷	〃
۴:	〃 〃	〃	ص۶۷	
۵:	〃 〃	〃	ص۶۸	
۶:	〃 〃	〃	ص۶۹	
۷:	نظام الدین صاعدی	حدیقۃ السلاطین	ص۷	
۸:	علی اصغر بلگرامی	حدیقۃ السلاطین	ص۳، ۴	
۹:	اختر حسن	قطب شاہی دور کا فارسی ادب		
۱۰:	حکیم شمس اللہ قادری	آثر قطب شاہیہ	ص۸۹	
۱۱:	ایضاً	ایضاً	ص۹۰	
۱۲:	ایضاً	ایضاً	ص۹۰	
۱۳:	محمد علی	مجموع الامثال (مخطوطہ)	ورق ۱ و ۱	

یہ مخطوطہ ادارۂ ادبیات اُردو میں ہے جس کا نمبر ۱۲۴۸ ہے اس مخطوطہ کا سائز [5.5 x 9.5] جملہ اوراق (۹۶) ہیں خط معمولی نستعلیق ہے فہرست میں کتاب کا نام بھی غلط لکھا گیا ہے اور فن بھی۔ اس مخطوطہ کا نام

"مجموع الامثال" ہے اس کو لغت کے فن میں ہونا چاہیئے۔

۱۴:	حکیم شمس اللہ قادری	مآثر قطب شاہیہ	ص ۹۰
۱۵:	محمد قلی	مجموع الامثال ورق ۵ ب ادارۂ ادبیات اردو	
۱۶:	شمس اللہ قادری	مآثر قطب شاہیہ	ص ۷۲
۱۷:	اختر حسن	قطب شاہی دور کا فارسی ادب	ص ۱۳۶ سے آگے
۱۸:	ایضاً	" "	ص ۵۰
۱۹:	شمس اللہ قادری	مآثر قطب شاہیہ	ص ۷۲
۲۰:	"	"	ص ۷۷
۲۱:	ایضاً	ایضاً	ص ۷۷ تا ص ۸۰
۲۲:	ایضاً	ایضاً	ص ۸۸

باب (۷)

علامہ کے اساتذہ اور طلباء

شیخ الاسلام خاتم المجتہدین شیخ بہاء الدین الحارثی والجبعی والعاملی المعروف شیخ بہائی

علامہ ابن خاتون ان خوش نصیب مجتہدین میں سے ایک ہیں جن کو ایسی جامع العلوم شخصیت کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا کہ ان کے بعد سوائے حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے کسی اور استاد کے آگے زانوے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ شیخ الاسلام شیخ بہائی اپنے عہد کے مجتہد اعلم تھے۔ وہ علامہ ابن خاتون کے نہ صرف استاد تھے بلکہ ماموں بھی تھے۔ علامہ نے انہی سے اجتہاد کا اجازہ حاصل کیا تھا۔

شیخ الاسلام کا پورا نام شیخ بہاء الدین محمد بن الحسین بن عبد الصمد الحارثی تھا۔ آپ علم کی دنیا میں شیخ بہائی کے نام سے معروف ہیں۔ سلسلۂ نسب جناب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خاص صحابی جناب حارث ہمدانی علیہ الرحمہ سے ملتا ہے اسی نسبت سے حارثی کہلاتے ہیں۔ آقائی عاملی اور آقائی میرزا آفندی کے بیان کے مطابق شیخ بہائی علیہ الرحمہ کی ولادت بعلبک میں ۱۳ محرم ۹۵۳ھ یوم چہار شنبہ بوقت مغرب ہوئی۔ یہ مقام جبل عامل کے قریہ جبعہ میں واقع ہے اسی تعلق سے ان کے اسم گرامی کے ساتھ الجبعی والعاملی لکھا جاتا ہے۔ اس طرح شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کا پورا نام شیخ بہاء الدین محمد بن الحسین بن عبد الصمد الحارثی الھمدانی والجبعی والعاملی ہے۔

شیخ بہائی علیہ الرحمہ علما گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ شیخ الاسلام کے والد شیخ حسین بن عبد الصمد خود فرقہ شیعہ کے علمائے اعلام میں سے تھے۔ اور شہید ثانی شیخ زین الدین العاملی کے شاگرد تھے۔ شیخ زین الدین علیہ الرحمہ ترکوں کے ظلم کے شکار ہوئے اور شیعہ ہونے کی پاداش میں قتل کر دیئے گئے۔ جب جبل عامل میں ترکوں

کا زور بڑھا اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا تو اس علما خیز خطہ سے علما ترک وطن پر مجبور ہوئے جناب شیخ حسین بھی اپنی زوجہ اور معصوم صاحبزادے شیخ بہاالدین کو لے کر جبل عامل سے نکل گئے اور ایران پہنچ کر یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔[1] شیخ بہاءالدین علیہ الرحمہ نے تعلیم و تربیت کے سارے مراحل یہیں طے کیے۔ سب سے پہلے تو شیخ بہائی نے اپنے والد بزرگوار سے علوم کی تحصیل کی اس کے بعد ایران کے چوٹی کے علما سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ شاہ طہماسپ کا زمانہ تھا علما کی خوب سرپرستی ہورہی تھی اسی کے بعد شاہ عباس اول کا عہد شروع ہوا اس بادشاہ کا عہد بھی علوم دینی و دنیوی اور دیگر فنون کے لیے بہت سازگار تھا۔ شیخ بہائی علیہ الرحمہ نے دونوں بادشاہوں کے زمانے دیکھے انہی کے عہد میں علمی دنیا میں بہت جلد اپنا مقام بنالیا۔ وہ اپنے وقت کے مجتہد اعلم ہوئے۔

شیخ بہائی علیہ الرحمہ علوم دینیہ کے تمام شعبوں پر مہارت تامہ رکھتے تھے یہی نہیں بلکہ دیگر علوم متداولہ و مروجہ پر بھی انہیں کامل دسترس حاصل تھی۔ شیخ الاسلام کے درج ذیل اساتذہ قابل ذکر ہیں:

۱۔ شیخ حسین بن عبدالصمد (والد بزرگوار) ۲: شیخ عبدالعالی کرکی ۳: شیخ محمد بن محمد بن ابی اللطیف المقدسی الشافعی ۴: الشیخ المولیٰ عبداللہ الیزدی ۵۔ المولیٰ علی (ریاضی کے استاد) ۶: القاضی المولیٰ افضل القاینی ۷: الشیخ احمد الکجائی الکھدمی المعروف پیر احمد ۸: عمادالدین محمود (طب کے استاد) ۹: مصر میں قیام کے زمانہ میں محمد بن ابی الحسن البکری سے استفادہ کیا۔

اسی طرح شیخ بہائی علیہ الرحمہ کے تلامیذ بھی کثرت سے رہے ہیں ان میں سے اکثر اپنے عہد کے جید علما و مجتہدین گزرے ہیں جیسے خود علامہ شیخ محمد بن ابن خاتون علیہ الرحمہ شیخ بہائی کی تالیف حریتہ ذبایح اہل الکتاب کے مرتب زہیر الاعرجی نے انیس[19] مشاہیر طلباء کے نام دیئے ہیں۔ شیخ بہائی کے اپنے شاگردوں میں نظام الدین بن حسن الساجی بھی ہیں جنھوں نے شیخ کی نصاب اجتہاد میں شامل کتاب جامع عباسی کے بیدسه ابواب لکھے۔ اس کتاب کے ابتدائی پانچ ابواب کی شرح علامہ ابن خاتون نے لکھی۔ جہاں

تک علامہ کی تالیفات کا سوال ہے وہ بے حساب ہیں زہیر الاعرجی نے (۱۰۴) تالیفات و تصنیفات کی فہرست دی ہے۔[۲]

شیخ بہائی کے علم و فضل سے شاہ عباس بے حد متاثر تھا اس نے شیخ الاسلامی کے منصب پر آپ کو فائز کیا یہ حکومت کے عظیم ترین عہدوں میں سے ایک ہے ایک عرصہ تک اس فرض منصبی کو نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ شیخ الاسلام علوم ظاھری و باطنی سے کما حقہ بہرہ ور تھے۔ دل میں قلندری کے جذبہ نے جو انگڑائی لی تو گھر بار مال و منال سب چھوڑ کر سیاحت و درویشی اختیار کی بقول صاحب نجوم السماء مرزا محمد علی:

> بعد ازاں بسوے درویشی و سیاحت رغبت نمود ترک اموال و مناسب کردہ مسافرت را بر اقامت اختیار نمود پس بحج بیت الحرام و زیارت حضرت رسول انام و ائمہ اہلبیت کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مشرف گردید بعد ازاں مدت سی (۳۰) سال در سیاحت و مسافرت بسر برد و بخدمت بسیاری از اہل فضل و کمال رسیدہ از فیض صحبت ایشان بہرہ دانی برداشتہ بسوی دیار عجم مراجعت نمود و ہم در اینجا رحل اقامت انداخت و باران فیض علم و فضل او بران دیار بارید پس متوجہ تالیف و تصنیف شد۔[۳]

ترجمہ: اس کے بعد دل میں خیال آیا کہ سیاحت کی جائے گھر بار اموال متاسب سب کو چھوڑ چھاڑ کر مسافرت اختیار کی پہلے حج سے فارغ ہوئے پھر حضرت ختمی مرتبت اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے اور تیس سال سیاحت میں گزارے صاحبان فضل و کمال سے شرف ملاقات حاصل اور استفادہ بھی کیا۔ پھر ایران لوٹے اور مستقل سکونت اختیار کی اور اپنی بارش علم سے مشتاقان علم و فضل کی کھیتیوں کو شاداب کرتے رہے اور تالیف و تصنیف میں منہمک ہو گئے۔

شیخ الاسلام تیس سال کی سیر و سیاحت و تحصیل علوم باطن کے بعد ایران لوٹے اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ شاہ عباس چونکہ شیخ بہائی علیہ الرحمہ سے بے حد متاثر تھا اس لئے وہ شیخ الاسلام کا اپنے سے جُدا رہنا گوارا نہیں کرتا تھا شیخ موصوف سفر و حضر میں ہمیشہ شاہ عباس کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی کا انتقال ۱۲ شوال ۱۰۳۴ھ میں ہوا۔ سنہ وفات کے تعلق سے تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے کوئی ۱۰۳۱ھ بتاتا ہے کوئی ۱۰۳۵ھ یا ۱۰۳۰ھ بتاتا ہے اسی حساب سے عمر کا تعین بھی کرتا ہے لیکن صحیح سنہ وفات ۱۰۳۴ھ ہجری ہے۔ ایک مستند عالم دین کے بیان سے یہ سنہ وفات متعین ہوتا ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ ملا محمد تقی مجلسی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب روضۃ المتقین کے آخر میں لکھا ہے کہ:

"بدرستکہ من در حیات او حال من شریف او پرسیدہ بودم فرمود کہ از ہشتاد و سال یکے کم است، بعد از... دو سال وفات یافتہ"

ترجمہ: میں نے ان کی زندگی ہی میں ایک بار عمر کے بارے میں پوچھا تھا علامہ [شیخ بہائی] نے خود مجھ سے فرمایا کہ (۸۰) سال میں ایک سال کم ہے... انہوں نے اس کے دو سال بعد وفات پائی۔

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام کی وفات ۸۱ سال کی عمر میں ہوئی کیوں کہ جب عمر پوچھی گئی تھی تو وہ خود ان کے بیان کے مطابق (۸۰) سال سے ایک سال کم یعنی ۷۹ سال کے تھے اس واقعہ کے دو سال بعد وفات ہوئی یعنی (۸۱) سال کی عمر میں انتقال کیا چوں کہ ولادت ۹۵۳ھ میں ہوئی تھی جس پر کم و بیش سب تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے اس لئے سنہ وفات [۹۵۳ + ۸۱ = ۱۰۳۴] برآمد ہوتا ہے۔

تذکرۃ العلماء میں شیخ بہائی کی بہت سی کرامتیں بھی لکھی گئی ہیں جن سے ان کے تصرفات کا اظہار ہوتا ہے خود شیخ بہائی کی وفات بھی ان کے تصرفات کی مظہر ہے۔

ایک دن شیخ بہائی علیہ الرحمہ ایک قبرستان میں گئے ان کے ساتھ کچھ طلباء اور خود مجلسی رحمہ اللہ بھی تھے انھوں نے بابا رکن الدین اصفہانی کی قبر سے ایک آواز سنی

یہ واقعہ انتقال سے چھ ماہ قبل کا ہے۔ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"من آں وقت قریب او بودم پس بسوے ما نظر کردہ فرمود کہ شما ایں صدا را شنیدید گفتم ما ہیچ نہ شنیدیم پس بہ گریہ و تضرع در آمدہ متوجہ بسوی امور آخرت شد۔۔۔۔ پیر سیدیم کہ چہ شنودی فرمود کہ مرا خبر دادہ اند بہ آنکہ مستعد مرگ شوم و بعد ازاں شش ماہ تقریباً وفات یافت و من بہ جنازہ اش مشرف شدہ ام"۔ ؎٦

ترجمہ۔ مَیں اس وقت قریب تھا۔ (علّامہ بہائی نے) میری طرف دیکھا اور دریافت کیا۔ تم نے اس صدا کو سُنا۔ مَیں نے کہا مَیں نے کچھ نہیں سُنا پھر (علّامہ بہائی) رو پڑے۔ سفرِ آخرت کی طرف متوجہ ہوئے۔ مَیں نے پوچھا (حضور نے) کیا سُنا بولے مجھے خبر دی گئی ہے کہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں اس کے تقریباً چھ ماہ بعد وفات پائی۔ مجھے جنازے میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔

شیخ الاسلام کا انتقال اصفہان میں ہوا جنازہ اصفہان سے مشہدِ مقدس رضویہؑ لایا گیا روضہ امام رضا علیہ السلام میں تدفین عمل میں آئی۔ شیخ الاسلام کے جنازہ میں تلامذہ کی کثیر تعداد تھی علاوہ ازیں خود بادشاہِ وقت بھی شریکِ جنازہ ہوا مورخین اور تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ جنازہ میں [۵۰۰۰۰] افراد نے شرکت کی۔

خاتم مجتہدین شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی علیہ الرحمہ اپنے عہد کے ذہین علماء میں سے ہیں ان کا میدانِ تفکر بے حد وسیع تھا۔ شخصیت انتہائی فعالی تھی۔ قدرت نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ نہایت دور بین نگاہ رکھتے تھے۔ مسائل کو سلجھانے اور بات کی تہہ تک پہنچ جانے کی رفتار بہت تیز تھی۔ عالم با عمل تھے اس لئے لوگوں کی اخلاقی کمزوریوں کو دیکھتے تھے تو ان کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ شیخ الاسلام ان کی اصلاح کی طرف بے کھٹکے متوجہ ہوتے اور غلط حرکات پر ٹوک دینے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ علّامہ کو کبھی اس کی پروا نہیں تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ مولانا کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ یہ ناگواریات کو اس طرح ہنس کر ٹال دیتے تھے جیسے ان کے نزدیک

ایسی باتوں پر دھیان دینے یا ان سے متاثر ہونے کی نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ وقت۔ وہ ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ شیخ الاسلام کے ہر اقدام میں شریعت کے راستے سے فرد و قوم کی اخلاقی حالت کو درست اور پابند کرنے کا جذبہ کارفرما رہتا تھا۔ لوگوں کو شیخ الاسلام کا بُری عادتوں پر ٹوکنا پسند نہ آیا وہ شیخ بہائی علیہ الرحمہ کے خلاف ہو گئے۔ جیسا کہ زمانہ کا دستور ہے کہ وہ اچھوں کو بُرا کہتا چلا آیا ہے شیخ الاسلام بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکے۔ لوگوں نے شیخ بہائی علیہ الرحمہ کو بدنام کرنے کے سارے حربے استعمال کئے اتہام اور جھوٹے الزام لگانے سے بھی نہیں چوکے۔ لیکن آخر میں انھیں کو منہ کی کھانی پڑی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کے رہا۔ ظاہر ہے جھوٹی پھلجھڑیاں زیادہ دیر تک اپنی بہار نہیں دکھا سکتیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا علامہ بہائی اپنی راہ پر سکون و اطمینان سے چلتے رہے۔ آخر مخالفین کو شرمندہ ہونا پڑا۔

علامہ بہائی فلسفہ و حکمت کے قطب الاقطاب تھے۔ دُھن کے پکے تھے۔ جس بات کا فیصلہ کرتے اسے تکمیل کو پہنچانے تک دم نہیں لیتے تھے۔ کسی کام کو شروع کرتے تو ختم ہونے تک اسی کام میں منہمک رہتے۔ انہوں نے مذہب کی روشنی میں سیاست کے صحیح معنی سمجھائے اور اس پر عمل کر کے بتادیا کہ

ایران کی تاریخ مذہب تشیع، تاریخ ادب اور تاریخ سیاست ملکی شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کے کارناموں کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ شیخ الاسلام نے ان سارے الوانوں کو اپنی مساعی جمیلہ سے بارونق با عظمت اور قابل احترام بنا دیا ہے۔ یہی صورت تاریخ دکن کی بھی ہے کہ تاریخ دکن بھی علامہ ابن خاتون کی مساعی جمیلہ کے تذکرے کو نظر انداز کر کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ علامہ اپنے اساتذہ حضرت شیخ بہائی رح اور حضرت میر محمد مومن رح کے نقش قدم پہ چلتے رہے اور وہی خدمتیں انجام دیں جو ان کے اساتذہ نے انجام دی تھیں۔

حضرت میر محمد مومن استرابادی علیہ الرحمہ پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ!

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ موسوی سادات سے ہیں اور استرآباد کے مشہور عالم خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ استرآباد ایران کے

صوبہ گیلان میں واقع ہے یہ علاقہ بھی جبل عامل کی طرح مردم خیز علاقہ ہے۔ حضرت میر محمد مومن کے والد سید علی شرف الدین اعلی اللہ مقامہ اور ماموں مولانا فخر الدین سماکی تھے۔ دونوں شخصیتوں کا شمار ایران کے معروف علماء میں ہوتا تھا۔ مولانا فخر الدین سماکی حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے حقیقی ماموں بھی تھے۔ اور استاد بھی۔ مولانا سماکی مشہور عالم دوران حضرت غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے۔

تذکرہ نویسوں نے حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی تالیف "حیات میر محمد مومن علیہ الرحمہ" میں صراحت کی ہے کہ حضرت میر محمد مومن ۹۸۹ھ ۸۲-۱۵۸۱ء میں حیدرآباد آئے اس وقت حضرت کی عمر تیس (۳۰) سال تھی اس لیئے حضرت کا سنہ پیدائش ۹۶۰ھ ۵۳-۱۵۵۲ء قرار پاتا ہے۔

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ نے تعلیم و تربیت اپنے ماموں مولانا فخر الدین سماکی سے حاصل کی اور بہت جلد علوم متداولہ و مروجہ میں کامل دستگاہ حاصل کر لی۔ نیز ان تمام محاسن اخلاق کی تربیت بھی پائی جو اعلیٰ کردار کے ارتقا کے لیئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ حضرت میر محمد مومن کے حسن اخلاق اور بلند کردار کا شہرہ سارے ایران میں تھا۔ حضرت نے مولانا نور الدین موسوی سے جن کا نام سید علی بن ابوالحسن الحسینی الابراہیمی تھا علم حدیث میں تبحر حاصل کیا حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے علمی تبحر اور اخلاق کی اپنی شہرت ہوئی کہ شاہ طہماسپ صفوی نے انہیں اپنے لڑکے حیدر مرزا کا اتالیق مقرر کیا۔ اتالیقی کے فرائض کو حضرت نے بڑی خوبی سے انجام دیا اسی زمانہ میں حیدر مرزا کی موت واقع ہوگئی اور ادھر ایران کے حالات بھی بدل گئے شاہ اسماعیل کے دور کی سیاسی افراتفری اور محمد خدا بندہ [۹۹۶ھ-۹۸۵ھ/۱۵۸۸ء-۱۵۷۸ء] کی سلطنت کے عدم استحکام نے حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کو دل برداشتہ کر دیا انہوں نے ایران چھوڑ دینے کا تصفیہ کیا وہاں سے نکل پڑے۔ وہ ایران سے نکل کر سب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچے پھر مدینہ منورہ کی زیارت کی (۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء) یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے دکن چلے آئے۔ یہ ۹۸۹ھ ۱۵۸۱ء کے محرم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو انتقال کئے ایک ہی سال ہوا تھا (۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء)

اور محمد ابراہیم قلی قطب شاہ کا تیسرا بیٹا محمّد قلی قطب شاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ جس زمانہ میں حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ دکن آئے میں بادشاہ نلدرگ کی مہم پر دارالخلافہ سے باہر تھا۔ حضرت میر محمّد مومن گولکنڈہ آنے کے بعد بہت دنوں تک سلطنت سے وابستہ نہیں ہوئے بلکہ یہاں درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ اور ایک مدرس کی حیثیت سے گولکنڈہ میں دن گزارنے لگے لیکن بہت جلد گولکنڈے میں حضرت کے علم و فضل، اخلاق اور انسان دوستی کی اتنی شہرت ہوئی کہ بادشاہ نے اس شہرت سے متاثر ہوکر حضرت کو باریاب کیا اور جیسی خبریں سنی تھیں ان سے کہیں زیادہ پایا تو انھیں اپنا مشیر مقرر کیا۔ ادھر سنہ ۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء میں جب شاہ میر کو بعض مصلحتوں اور وجوہات کی بناء پر پیشوائی کے عہدے سے علٰحدہ کردیا گیا تو اس عظیم اور کلیدی عہدے پر حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ کا تقرر کیا گیا۔ علاّمہ نے کمال تدبر سے اس عہدے کی تمام ذمہ داریوں کو نبھایا۔ حضرت کی سیاسی بصیرت نے سلطنت کے وقار کو دوسری معاصر سلطنتوں کی نگاہ میں کافی بلند کیا۔ پیشوا کے سلطنت کی دیانت داری اور سلطنت سے محبت اور بادشاہ سے وفاداری اتنی پر خلوص تھی کہ قدم قدم پر ان کے اعزاز میں اضافہ ہوتا رہا۔ بادشاہ نے حضرت کو محل کے اندر تک اپنے میانہ میں آنے کے اعزاز سے مفتخر کیا۔ یہ اعزاز پھر اگر کسی کو ملا ہے تو وہ انہی کے شاگرد علاّمہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کو ملا ہے ورنہ تمام اکابرین اور عمائدین سلطنت کو محل کے باہر ہی اپنی سواریوں سے اُتر کر شاہی دربار میں باریاب ہونا پڑتا تھا۔

حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ سنہ ۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء میں پیشوائی کے عہدۂ جلیلہ سے سرفراز کئے گئے اور انتقال تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ پیشوائی یا وکیل سلطنت حکومت کا سب سے اونچا عہدہ ہوتا تھا یعنی بادشاہ کے بعد پیشوا ہی حکومت کا مقتدر اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ حضرت میر محمّد مومن علیہ الرحمہ نے دو بادشاہوں کے دور میں پیشوائی کی محمّد قلی قطب شاہ نے حضرت کا تقرر اس عہدے پر کیا اور وہ بادشاہ کے انتقال تک اسی عہدہ پر رہے محمّد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد جب محمّد قطب شاہ اس کا جانشین ہوا تو اس نے بھی.....

علامی فہامی حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کو اس عہدے پر بحال رکھا۔ علامی فہامی نے کوئی (۴۰) سال سلطنت قطب شاہیہ کی خدمت کی اور حکومت کو مستحکم کرنے کے ہر امکان سے استفادہ کیا قدیم دکنی تہذیب اور ایرانی تمدن میں خوشگوار امتزاج پیدا کر کے ایک ایسی ثقافت کی نیو رکھی جس میں باہمی میل جول بلکہ شیر و شکر ہو کر جینے کی روح کو خمیر کر دیا گیا تھا۔

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کا ایک خاص مقصد تھا جس کو انہوں نے تہذیب و تمدن کے راستہ سے حاصل کیا۔ یہ دکنی تمدن علامی فہامی حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی وسیع النظری اور سیاسی بصیرت کی رفعت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ علامی فہامی حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ حیدرآباد میں شیعت کو عام کرنے کی آرزو لے کر یہاں آئے تھے۔ انھوں نے چاہا تھا کہ سلطان قلی قطب الملک کی طرح ملک کے طول و عرض میں شیعت کو پھیلایا جائے وہ جانتے تھے کہ اس مقصد کو تہذیبی راستوں کے ذریعہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ جانتے تھے کہ دکن ایرانی تمدن سے کافی مانوس ہو چکا ہے اور اس تمدن میں شیعی عناصر موجود ہیں لہذا اسی راستہ سے اس میں ایسی خوبصورت اور دلآویز کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے جس سے مقصد بھی حاصل ہو سکتا ہے اور کسی کا عقیدہ متاثر بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ انہوں نے محمد قلی قطب شاہ کی افتادِ طبع کو جوں کا توں رہنے دیا اور بڑے تدبر سے اس کے خیالات کو جنگ اور توسیع پسندی کے مکروہ دلدل سے نکال کر شیعت کو دکنی کلچر میں سمو دینے کی طرف موڑ دیا۔ بادشاہ علامی فہامی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے یہ بات مان لی اور دکنی تمدن کے ایسے بنیادی اصول مرتب کیے جس میں ایرانی تمدن کا غلبہ تھا لیکن دکنی کلچر کے اقدار بھی اس نئے تمدن کے بنیادی اقدار تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے اسلامی عیدوں جیسے عید الفطر عید الاضحیٰ۔ عید مولود کعبہ۔ عید بعثت۔ عید نوروز محرم وغیرہ کے ساتھ ساتھ "مرگ" بسنت۔ دیوالی، ہولی وغیرہ جیسے تہواروں کو سرکاری طور پر منانے کی منظوری حاصل کر لی اور یہ عید اور تہوار عہد قطب شاہیہ میں

سرکاری طور پر منائے جاتے تھے۔

علامہ نے ایک اہم کام کیا کہ سلطنت کے انتظامیہ کو مضبوط کرنے کے لئے ایران سے اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل شخصیتوں کو حیدرآباد میں اکٹھا کر لیا جیسے مرزا محمد امین شہرستانی اور علامہ ابن خاتون وغیرہ۔ وہ شیعیت کو انسانی بھلائی کی اساس پر عام کرنے کے قائل تھے اسی کے لئے علامی فہامی نے سارے جتن کئے۔ اس سلسلہ میں سرکاری سطح پر جو کچھ کیا جاسکتا تھا وہ کیا اس کے علاوہ خود اپنی جاگیروں میں عاشور خانے مسجدیں سرائے وغیرہ تعمیر کروائے اور محرم میں علم کی ایستادگی کو عام کرنے اور محرم کی رسوم کو رائج کرنے میں بہت مستعد رہے۔ چنانچہ محرم کی تقریبوں اور رسموں کو منانے کے سلسلہ میں سرکاری سطح پر بڑی سہولتیں بلکہ فراخدلانہ امداد دی جاتی تھی عاشور خانوں اور مسجدوں وغیرہ کے انتظامات کے لیئے زمین مقطعہ اور جاگیریں وقف کی جاتی تھیں۔

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے پاس دین اور دُنیا دونوں جمع ہو گئے تھے۔ وہ انتہائی متقی پرہیزگار تہجد گزار تھے۔ سارے شہر میں علامی فہامی کے تقدس کی دھوم تھی۔ وہ عالم متبحر تھے ظاہری اور باطنی علوم میں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ علوم معقول و منقول میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ بڑے مسافر نواز تھے۔ ان کے حسن خلق کی کافی شہرت تھی۔ اپنے دورِ پیشوائی میں بڑے اعزاز سے معزز ہوئے۔ علامی فہامی کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر شاہی محل سرا کے اندر تک جاتے تھے۔ یہ اعزاز انہی کے شاگرد علامہ ابن خاتون کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

"میر صاحب علم جفر، نجوم، نیرنجات، طلسمات، عملیات اور تسخیر اجنّہ میں بھی ماہر تھے، چنانچہ صدیاں گزرنے کے باوجود آپ کے تسخیر اجنّہ اور دستِ غیب کے قصے اب بھی زبان زد خاص و عام ہیں"۔ [۶]

میر صاحب کا عظیم کارنامہ "میر کا دائرۃ" کا قیام ہے۔ اس قبرستان کو حیدرآباد میں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ علی اصغر بلگرامی لکھتے ہیں:

"آپ کا سب سے بڑا فیض جاریہ اور یادگار "میر کا دائرۃ" ہے جس کی اراضی کو آپ نے سنہ ۹۹۲ھ اور سنہ ۱۰۰۰ھ کے درمیان خرید کر بصرف زر کثیر

کربلائے معلیٰ سے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ خاکِ شفا منگواکر دائرے
کی زمین کو قد آدم کھدواکر اس میں (۷۰) بارِ شتر خاک ملوادی اس خطہ کو
دفن اموات کے لئے مخصوص اور وقف کردیا تھا۔ ۸؎

بہت جلد اس دائرے کی شہرتِ عام ہوئی اور میتیں دفن ہونا شروع ہوئیں ابتداء
میں یہاں صرف شیعہ میتیں ہی دفن ہوا کرتی تھیں جن میں مشاہیر شخصیتیں بھی ہیں جو یہیں آرام
کررہی ہیں اب تک دائرے میں (۲۲،۲۰) لاکھ میتیں دفن ہوچکی ہیں۔ آج بھی تدفین
کے سلسلہ میں میر صاحب کی مہیا کی ہوئی ساری سہولتیں مہیا ہیں۔ میر صاحب نے یہ
بھی اہتمام کیا تھا کہ غسالوں کو تربیت دے کر تیار کیا تھا۔ تربیت یافتہ غسالوں کی یہ
جائیداد موروثی تھی اس سلسلہ کی کڑی آج تک چلی آرہی ہے

میر صاحب کا انتقال سنہ ۱۰۳۴ھ سنہ ۱۶۲۴ء میں (۴۷) سال کی عمر میں ہوگیا۔ میر صاحب
کی موت کا سبب ان کے صاحبزادے میر محمد الدین کا انتقال تھا۔ میر محمد الدین میر صاحب
کے اکلوتے سعادت مند فرزند تھے۔ اپنے باپ کی طرح قابل تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۰۳۴ھ
میں ہوا۔ انتقال کے (۴۰) دن بعد علامی فہامی کا بھی انتقال ہوگیا۔ انھیں دائرے
میں اپنے ہی بنائے ہوئے مقبرے میں بیٹے کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

میر صاحب اپنے عہد کے عظیم شاعر اور صاحبِ تصنیف و تالیف دانشور
رہے ہیں کتاب الرجعۃ ۲۔ رسالہ مقداریہ ۳۔ رسالہ فی العروض کافی مشہور
ہیں جو ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ شعری سرمایہ بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر زور
نے "حیاتِ میر محمد مومنؒ" میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ حضرت کا کلام انڈیا آفس
لائبریری میں محفوظ ہے۔ ۹؎ یہ شعری سرمایہ مختلف اصنافِ سخن پر پھیلا ہوا ہے تبرکاً غزل
کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

دلا پیوستہ با ناسازگاراں سازگاری کن ٭ کہ باشد سازگار خود کنی ناسازگاری را
خوشم کہ در دل من عشق مدعا نگذاشت ٭ مرا بہ پہلوے شبہاے تار وا نگذاشت

علامہ ابنِ خاتون علیہ الرحمہ کے تلامذہ

حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ اور علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی علمی زندگی کا آغاز درس و تدریس

ہی سے ہوتا ہے دونوں بزرگواروں کی یہ امتیازی خصوصیات رہی ہیں کہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ پیشوائی پر فائز ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے تدریسی شغف کو برقرار رکھا اور علمی فیضان ان کی ڈیوڑھیوں سے جاری رہے۔ جن شخصیتوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک تدریسی انہماک کو منقطع ہونے نہیں دیا ان کے شاگردوں کی کثرت کا علم اندازہ قائم کرلیا جا سکتا ہے لیکن تذکروں اور تاریخوں میں ان بڑی ہستیوں کے شاگردوں کے نام بہت کم ملتے ہیں ویسے ایران اور دکن میں بے شمار شاگرد رہے ہیں۔

علّامہ ابن خاتون کے دکن میں جن شاگردوں کے نام ہمیں مل سکے ان میں نظام الدین صاعدی صاحب حدیقۃ السلاطین، علی بن طیفور صاحب حدائق السلاطین، مولانا شیخ ہارون قدس فقہ اور محمد بن شرف الدین حسینی اور ظہیر الدین محمد نجفی ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد بن عبداللہ الصاعدی علّامہ ابن خاتون کے مجلسیوں میں بھی تھا اس نے علّامہ سے علمی استفادہ کیا تھا حدیقۃ السلاطین علّامہ کی ایماء پر ہی اس نے لکھی تھی یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل تھی پہلی جلد تو شائع ہو چکی ہے لیکن دوسری جلد مفقود ہے۔ حدیقۃ السلاطین کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے:

زسو میای اصلاح او درست شدہ ÷ شکستہ کہ من از خامہ کردہ ام تحریر
ز کیمیای افادات او سخنم ÷ زر تمام عیاری شدہ رواج پذیر

ان اشعار سے نظام الدین احمد کی علّامہ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

علی بن طیفور بسطامی کے تعلق سے پچھلے اوراق میں لکھا جا چکا ہے وہ علّامہ کا بہت ہی سعادت مند شاگرد رہا ہے اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ علّامہ کے شاگرد ہونے کا اظہار بڑے انکسار کے ساتھ اس طرح کیا ہے کہ "راقم الحروف (علی بن طیفور) نسبت بہ آں حضرت علّامہ بندگی دارد بزبان گستاخانہ خود را در سلک شاگرد دانش می شمارد"۔ صاحب نجوم السماء نے علّامہ ابن خاتون کے ایک اور شاگرد کی نشان دہی کی ہے وہ ہیں محمد بن شرف الدین حسینی انہوں نے "جوامع الکلام" لکھی جس میں اپنے استاد کی مدح کی ہے اور علّامہ کے مرتبہ کے لحاظ سے خاص القاب سے افضل

ملقب کیا ہے جیسے المولے الاعظم، الشیخ الاکرم، جامع صفات مکارم اخلاق و الشیم وغیرہ۔ اور تعریف میں شعر بھی لکھے ہیں۔ تفصیل پچھلے صفحات میں لکھی جا چکی ہے۔

مولانا شیخ ہارون علامہ کے خاص شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں انھوں نے قطب شاہی حکومت میں (۲۰) سال فقہ کا درس دیا ہے۔ اپنے دور کے بہت اچھے فقیہ تھے۔ علامہ کے ایک اور شاگرد ظہیر الدین محمد تجفی تھے۔ علامہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے یہ ان کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ظہیر الدین محمد تجفی بہت ذہین طلباء میں سے تھے۔ انہوں نے کم عمری میں مدارج علوم طے کر لئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ ابن خاتون نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو قاضی القضاۃ کے عہدے سے سرفراز کیا۔ اس کے بعد علامہ ہی نے اس شاگرد کو دبیری کا عہدہ عطا کیا۔

جیسا کہ مسلسل ذکر ہوتا چلا آرہا ہے کہ علامہ کا دولت خانہ دراصل ایک عظیم الشان حوزہ علمیہ تھا۔ جہاں دن رات علمی چرچے رہتے تھے۔ عام ذہن آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ طلباء کا کتنا ہجوم رہتا ہوگا لیکن کسی تاریخ، سیر، اور تذکرہ میں علامہ کے شاگردوں کی اتنی تفصیل بھی نہیں ملتی جتنی خود ان کے استاد شیخ بھائی کے طلباء کی ملتی ہے۔ اکثر ایسا لطیفہ ہوا کہ ہجوم میں جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ علامہ ابن خاتون کی ڈیوڑھی پر مورخوں، تذکرہ نویسوں اور سیرت نگاروں نے شاید تلامذہ کی اتنی بھیڑ لگی دیکھی ہو کہ وہ ان کے نام تک نہ لکھ سکے ہوں۔ دوسرے اس بے بضاعت، ہیچمداں کی تحقیق راستے سے عدم واقفیت بھی ایسے اسباب ہیں کہ طلباء کے بارے میں معلومات بہت مختصر ہو کر رہ گئیں۔ مستقبل کا بالغ نظر محقق اس باب میں وسعت ضرور پیدا کرے گا۔

باب (۷) حوالے

۱: زہیر الاعرجی، حرمۃ الذبائح اہل الکتاب عربی ص۲۰
۲: بہاء الدین عاملی، جامع عباسی، فقہ کی کتاب ہے اور آج بھی شامل نصاب ہے۔
۳: زہیر الاعرجی، حرمۃ الذبائح اہل الکتاب عربی ص۱۴،۲۱،۴۱ (۴) محمد علی، نجوم السماء ص۲۶ اس سے آگے
۵: محمد علی، نجوم السماء ص۲۶ (۶) محمد علی، نجوم السماء ص۲۷ (۷) علی اصغر، میرکا دائرہ ص۶
۸: علی اصغر، میرکا دائرہ ص۶ (۹) محی الدین قادری زور، حیات میر محمد مومن ص

باب (۸)

علامہ کے عہد کا محرم

دکن میں شیعیت کم و بیش بہمنی سلطنت کے آغاز ہی سے سپیدی سحر کی طرح نمایاں ہونے لگی تھی محرم کی تقریبات اور اس کے مراسم شیعوں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں بلکہ شیعیت کی اساس ہیں۔ بہمنی دور ہی سے محرم کے رسوم عوام و خواص میں بلا لحاظ مذہب و فرقہ منائے جاتے تھے۔ ان مراسم کی ادائیگی میں شیعوں کا انہماک امتیازی حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں وجود میں آئیں ان میں قطب شاہی حکومت شروع ہی سے شیعہ حکومت رہی ــــــــــــ

ــــــــــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس حکومت کے سارے بادشاہ شیعہ تھے۔ یہاں آغاز ہی سے خطبہ میں ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کا نام لیا جاتا رہا۔ محرم میں ان بادشاہوں کا مراسم کا بجا لانا تو مسلّم ہے لیکن عہد عبداللہ قطب شاہ سے پہلے تک ان مراسم عزا کی تفصیل فی الحال دستیاب نہیں ہو سکی البتہ عہد عبداللہ قطب شاہ میں محرم کی تقریبات کا جو منظر ہمیں ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدرآباد کے عہد میں بھی یہی مراسم رائج ہوں گے کیوں کہ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کے قدم بہ قدم چلا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت یوں بھی قوی ہو جاتی ہے کہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ نے محمد قلی قطب شاہ کے ذہن سے اس کی توسیع پسندی کے رجحان کو نکال کر اس کو شیعیت کو عام کرنے کی طرف مائل کرنے میں مکمل کامیابی حاصل کی تھی۔ میر صاحب ہی کی ایما سے تمام مذہبی تقریبات کو سرکاری سطح پر منایا جانے لگا تھا۔

عبداللہ قطب شاہ کے تخت سلطنت پر آنے کی تھوڑی مدت بعد علامہ ابن خاتون پیشوائی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے دورِ پیشوائی میں محرم اسی طرح سے منایا جانے لگا جیسا کہ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کے زمانہ میں منایا جاتا تھا کیوں کہ علامہ بھی اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے تھے صاحب حدیقۃ السلاطین مرزا نظام الدین الصاعدی نے اپنی تاریخ میں جو علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی ایما پر لکھی گئی ہے بڑی تفصیل سے محرم کی تقریبات کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ گلزارِ آصفی کے مولف نے بھی محرم کی تفصیلات بیان کی ہیں ڈاکٹر قادر محی الدین زور مرحوم نے اپنی کتاب کلیات محمد قلی قطب شاہ میں مراسم محرم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر زور صاحب کے یہ جملے محل نظر ہیں کہ

"حیدرآباد میں ان تقریبوں کا آغاز سلطان محمد قلی قطب شاہ ہی نے کیا تھا۔ تعزیہ داری اور مجلسیں اسی کی قائم کی ہوئی ہیں"

صاحب آثر قطب شاہیہ حکیم شمس اللہ قادری نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ

"سلطان محمود شاہ بہمنی نے ۹۰۱ھ میں سلطان قلی کو قطب الملک کا خطاب دے کر تلنگانہ کا طرفدار بنایا تو اس نے تازہ وارد ایرانیوں کی جماعت کثیر ہمراہ لے کر گولکنڈہ آیا اور عشرہ محرم میں رسم تعزیہ داری جاری کی"۔ [1]

دکن میں تعزیہ داری سلطان قلی کے صوبہ داری کے زمانہ ہی سے باضابطہ طور پر شروع ہو چکی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں محرم کی تقریبات میں بہت اضافہ ہوا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ میں پہلا علم محمد قلی قطب شاہ نے ایستاد کیا ویسے نعل صاحب کا تبرک تو ابراہیم قلی کے عہد ہی میں حیدرآباد آ چکا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا ایستاد کیا ہوا علم آج بھی گولکنڈہ کے قدیم عاشور خانہ میں ایستاد ہوتا ہے یہ علم لوہے کا ہے جس پر بادشاہ کا نام اور سنہ بھی کندہ ہے۔

ڈاکٹر زور تقریبات محرم کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

"محرم کے مراسم کو محمد قلی نے اس خوبی سے رائج کیا کہ شیعوں کے علاوہ

سُنّیوں اور ہندوؤں نے بھی ان ایام کو خاص اہتمام سے منانا شروع کیا
اور خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تک تو ایسی مصروفیتیں رائج
ہوگئیں جن میں سلطنت قطب شاہیہ کا ہر متنفس [خواہ وہ کسی مذہب
و ملّت سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو] حصّہ لیتا تھا۔ ۔ ۔ ۔" ؎

حدیقۃ السلاطین میں ہے کہ "قطب سلطنت کا قدیم — طریقہ ہے اور خاص محمّد قلی قطب شاہ کے زمانہ سے رواج ہے کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی خود بادشاہ بھی اور تخت زر نگار سے اُتر جاتے لباس شاہی کو جامہ عزا میں تبدیل کر دیتے ہیں اور تمام ممالک محروسہ میں حکم نافذ ہے کہ کہیں کوس، نقارہ، طبل یا دمامہ نہ بجے اور گانے بجانے والے بھی اپنے آلات کو غلافوں میں رکھ دیتے ہیں۔ شاہی اور عام باورچیخانوں میں گوشت کی آمد بند ہو جاتی ہے۔ تاڑی سیندھی، بھنگ اور دیگر نشہ آور چیزوں کی دکانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ قصاب لوگ گوشت بیچتے ہیں اور نہ تنبولی پان اس طرح شہر کے حماموں میں حجام بھی اپنا کام بند کر دیتے ہیں" واحکام مذکور بر جمیع مسلم و کافر طبقات امام دریں ایام غم انجام در ممالک محروسہ جاری می دارند"

"ایام محرم میں محمّد قلی قطب شاہ کی دریادلی بیں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔
چنانچہ لکھا ہے کہ بارہ اماموں کے لنگر میں ۶۰ ہزار ہون مجاوروں
اور خادموں کے وظیفوں اور دیگر امور میں صرف ہوتے، اور محرم
کے بعد بارہ ہزار ہون اور خرچ کیا جاتا جو زر عاشوری کہلاتا۔ اس
کے علاوہ نجف اشرف، کربلائے معلی اور دیگر مقامات کو ہر سال ایک
لاکھ ہون تقسیم کے لئے روانہ کئے جاتے۔ (تاریخ طغرہ [۲۱]) "

۹۹۹ھ میں محمّد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کو حیدرآباد سے موسوم کیا گیا۔ چار مینار شہر کا سنگ بنیاد ہے اسی کے ساتھ ساتھ عوامی دواخانہ دارالشفا اور بادشاہی عاشور خانہ کی تعمیر بھی شروع ہوئی۔ یہ عمارتیں مختلف سنین میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ ان میں بادشاہی عاشور خانہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ گولکنڈہ سے یہاں ادا ہوتے والی تقاریب عزا اب اِس

عاشور خانہ میں منتقل ہوگئیں کیوں کہ بادشاہ حیدرآباد کے نوتعمیر شدہ محل میں منتقل ہو گئے تھے ۔۔۔۔ محمد قلی قطب شاہ نے بادشاہی عاشور خانہ میں (۱۴) جواہرات سے مزین سونے کے علم اس عاشور خانہ میں ایستادہ کئے تھے ۔ علموں کی ڈھنٹیاں زرلفت کی تھیں جن پر آیاتِ قرآنی اور ماثورہ ادعیہ کاڑھی گئیں تھیں ۔ یہ علم، علم سازی کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے ۔ اس عاشور خانہ کی تزئین میں عبداللہ شاہ نے خوبصورت اضافہ کیا۔ جیسے کاشی کا کام وغیرہ مزید تفصیل ڈاکٹر زور کی زبانی سنیئے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"..... اور عاشور خانہ کے صحن میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کی متوازی بنادی گئی ہیں اور ہر صف میں تقریباً ایک ہزار طاقچے ہیں تاکہ اتنے ہی چراغ روشن ہوں اور قاعدہ یہ ہے کہ پہلی شب میں پہلی صف روشن کی جاتی ہے اور دوسری میں پہلی اور دوسری اسی طرح دسویں کی رات پوری دس صفیں روشن ہوجاتی ہیں اور دس ہزار چراغوں کی روشنی سے عاشور خانہ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغدان بھی "بصورت اشجار پر شاخ" بنائے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ایک سو بیس شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا گیا اور ان پیتلی جھاڑوں کو عاشور خانہ کے دالانوں کے برابر رکھا جاتا ہے اور خود ایوانوں میں اور حوض کے اطراف قدِ آدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی ہیں۔

عاشور خانہ میں سیاہ پوش عزاداروں کا صبح و شام اژدہام رہتا تھا خوش آواز ذاکر خوش خواں نغمہ پرداز دلسوز مرثیے اور غم اندوز اشعار اس درد و اثر سے پڑھتے رہتے کہ سننے والوں پر بے اختیار رقت طاری ہوجاتی۔ عصر کے وقت خود بادشاہ بنفشئی رنگ کا لباس پہن کر آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ مخمل کے سنگھاسن میں بیٹھ کر جملہ سیاہ پوش مقربوں، مجلسیوں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ الاوہ

میں آتا اور دو خوش آواز ذاکر شاہی سنگھاسن کے دونوں طرف خود بادشاہ کے مصنفہ مرثیے پڑھتے ہوئے آتے۔ جب بادشاہ عاشور خانہ کے دروازے میں داخل ہوتا تو سواری سے اُتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام کے وقت تمام کافوری شمعوں اور ایوان کے برابر کے چراغوں کو بھی اپنے ہاتھ ہی سے روشن کرتا اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ معصومینؑ کی مدحیں پڑھی جاتی چراغ روشن کرنے کے بعد ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑے ہو کر شہدائے کربلا کی ارواح کے لئے باآواز بلند فاتحہ پڑھتا۔ جس کے بعد بادشاہ دولت خانہ عالی کی طرف واپس ہو جاتا اور وہاں کے عاشور خانہ میں امراء و وزراء کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں بسر کرتا یہاں کندوری جو بغیر گوشت کے قسم قسم کے تکلفات سے تیار کی جاتی اور شربت اور تک ٹمک وغیرہ کی تقسیم عمل میں آتی۔

ڈاکٹر زور صاحب مزید تفصیلات تقاریب محرم اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ "محمد قلی نے۔۔۔۔ تعزیہ داری کے علاوہ محرم میں ایسی دل چسپ تقریبیں بھی رائج کیں کہ تمام اہل ملک ان میں حصہ لینے لگے مثلاً روشنی کپڑوں، کھانوں، سبیلوں وغیرہ کی عام تقسیم اور چھٹی محرم کو داد محل کے سامنے کا عظیم الشان منظر۔۔۔۔ ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے محرم کو سلطنت قطب شاہی کا ایک ناقابل فراموش عنصر بنا دیا۔۔۔۔۔۔

چھٹی محرم کو الاوۂ بیرون دولت خانہ کے علم (جن کا اہتمام کوتوال کے ذمہ رہتا ہے) میدان دلکشا سے وسیع الفضائے داد محل میں لاتے ہیں۔ اس میدان کے اطراف و اکناف کے بازاروں اور راستوں پر چراغاں کئے جاتے ہیں اور رابت اور گنبدوں (یعنی تعزیوں) کو بہترین زیب و زینت اور قسم قسم کی نقاشی اور تکلفات سے آراستہ کر کے اور ان کے اندر اور باہر بہت سی شمعیں روشن کر کے لے آتے

ہیں اور مکڑی سے بڑے بڑے درخت اور بیلیں بنا کر ان کو بھی روشن کرتے ہیں۔ فانوسوں، مشعلوں اور چراغوں کا ایک انبوہ علموں کے سامنے چلا آتا ہے اور کثیر تعداد میں عربی اور عجمی لوگ اور شیعیان د ان ائمہ طاہرہ ہاتھوں میں شمعیں لئے ہوئے دونوں طرف اور ان کے درمیان ذاکران و مداحاں مرثیے اور مدح پڑھتے ہوئے داد محل کے میدان میں آتے ہیں۔ داد محل کے نیچے دو طرفہ چراغ روشن رہتے ہیں اور علم درمیان میں جن کے اطراف تمام سیاہ پوش عزاداران د ذاکران وغیرہ کھڑے ہوتے ہیں۔

داد محل کی چوتھی منزل پر سے جب بادشاہ اس چراغ زار پر نظر ڈالتا ہے جو ماتمیوں کے پر داغ سینے کے مشابہہ ہے تو عزاداران کے شور وشیوں سے اس پر بھی رقت طاری ہو جاتی ہے اور سیاہ پوشان دلفگار کے لئے اپنے یہاں سے نان ریزہ کے خوان روانہ کرتا ہے اور کوتوال تمام مجمع کے ساتھ بادشاہ اور سلطنت کے لئے دعا کرتا ہے اسی طرح ایام عاشورہ کے ختم تک شہر کے جملہ محلوں کے علم اس میدان میں آتے رہتے ہیں۔

ساتویں محرم کی صبح میں بادشاہ ندی محل میں برآمد ہوتا ہے شاہ نشین میں کھڑا رہتا ہے اور ایران اور ہندوستان کے حاجب طلب کئے جاتے ہیں اور تمام مجلسی امیر وزیر مقرب اور ہر طبقہ کے ملازمین سیہ پوش ہو کر حاضر ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تمام شہر و مضافات کے علم طلب کئے جاتے ہیں اور علموں کے ساتھ شہر کی تمام مخلوق دروازہ بارہ امام میں سے داخل ہوتی ہے ہندو مسلمان سب کو داخلہ کا بار عام دیا جاتا ہے اور یہ مجمع ندی محل کی فضا میں روز محشر کا انبوہ بنا رہتا ہے۔ علموں کو ترتیب کے ساتھ بادشاہ کے سامنے لے جاتے ہیں اور اس وقت ساتھیوں کا ماتم اور

شور وشیون اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ عرش اعظم تک پہنچتا ہے اس وقت علموں تابوتوں گنبدوں اور تعزیوں کو دیکھ میدان کربلا میں اہلِ بیت کی گرفتاری اور پریشانی کا منظر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور وہ بے اختیار رونے لگتے ہیں۔ بادشاہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے ہر علم کی ایک ابریشمی ڈھٹی باندھی جاتی ہے اور خادموں کو ایک خریطۂ زر دیا جاتا ہے اسی طرح ظہر کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

نویں محرم کی رات میں دولت خانہ عالیہ کے اندرونی الاوہ کے علموں کو میدان دربار خسروی (یعنی چار کمان کے میدان) میں لے آتے ہیں اس رات بادشاہ پھول چڑھانے اور علموں کو آراستہ کرنے کے بعد خاصہ کی کافوری شمعیں جملہ مجلسیوں مقربوں اور حجاب عظیم الشان کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا ہے اور شاہی سپہ سالار کے ہاتھوں سے کل سلحداروں اور عساکر میں تقسیم عمل میں آتی ہے۔ سرخیل شاہی کے ہاتھ میں شمشیر خاصہ دی جاتی ہے اور تمام مجلسی سردار اعیان و اکابراور دولت خانۂ شاہی کے جملہ چھوٹے بڑے ملازم ہاتھوں میں شمعیں لئے ہوئے نکلتے ہیں اور دروازۂ الاوہ میں سے میدان دربار (چار کمان) میں بے شمار مشعلوں، چراغوں اور فانوس کے ساتھ علموں کو لے آتے ہیں میدان کے ایوانوں کے سامنے چالیس پینتالیس ۴۵ فٹ بلند ہاتھی شیر اور درخت سرو وغیرہ کی عجیب دلپذیر شکلیں بناکر روشن کی جاتی ہیں اور اس میدان کے چار کمانوں پہ سر سے پاؤں تک طاقوں محرابوں اور طرح طرح کے درختوں کے نقشے اتار کر ان میں روشنی کی جاتی ہے اور تمام میدان میں بھی لکڑیاں باندھ کر چراغ لگائے جاتے ہیں۔

محل کی اس چوڑی دیوار پر جس کے برابر سے علموں کو میدان میں

لے جاتے ہیں بادشاہ تقریباً پانچسو قدم علموں کے ساتھ جاتا ہے اور آخر کار اس کمان پر جو چار مینار کے مقابل (اب بھی موجود ہے) پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے تمام میدان اور دوسری کمانوں کا منظر سرتاپا چراغاں نظر آتا ہے اور بے حد حساب مخلوق خدا جس میں شریف وضیع، چھوٹے بڑے، عورت مرد سب ہی شامل ہوتے ہیں اس وسیع میدان میں جمع ہو کر اس چراغاں اور آتشی گلستان کا تماشا کرتے ہیں۔

علموں کو بیچ میدان میں لانے کے ساتھ ہی ذاکر اور مداح حلقوں میں تقسیم ہو کر ذکر و مدح پڑھتے ہیں اور دو گھنٹے کے بعد بادشاہ اسی کمان اور دیوار پر سے چلتا ہوا علموں کے ساتھ واپس ہوتا ہے اور سب لوگ دُعاء اور فاتحہ کے بعد واپس ہو جاتے ہیں۔

دسویں کی صبح کو بادشاہ پورا سیاہ پوش اور پابرہنہ ہو جاتا ہے اور جب اس سے سیاہ پوش امیر مقرب، وزیر، ملازم اور خاص غلام زاری وشیوں کرتے مرثیے پڑھتے ہوئے علموں کے آگے الاوہ حضور کی طرف آتے ہیں تو بادشاہ بھی ماتم کرتا ہوا الوان الاوہ کے قریب کی مسجد میں پہنچتا ہے۔ وہاں قصہ شہادت اور گرفتاری حرم محترم سنتا ہے جس سے دل خونناب اور آنکھیں سیلاب بن جاتی ہیں۔ ذاکر کے بعد خطیب نہایت فصاحت کے ساتھ باواز بلند شہداء کے لئے فاتحہ اور شاہ کے لئے دُعاء پڑھتا ہے اور بادشاہ دولت خانہ کو مراجعت کرتا ہے جہاں زیارت حضرت سیدالشہدا اور روز عزا کی نماز پڑھ کر خاص و عام کو کندوری تقسیم کرتا اور حکم دیتا ہے کہ دو سو (۲۰۰) یتیم سید زادوں کو پیش کریں جن کو نفیس لباس اور رقم دی جاتی ہے"۔ [۳]

پچھلے اوراق میں جن مضافاتی محلّوں کے علموں کے ندی محل، دا دمحل وغیرہ میں آنے کا

ذکر کیا گیا ہے (۱)

"سلطنت اور اس کے حوالی دنواحی میں چالیس الاوے تھے اِن میں حیات آباد، کلثوم پورہ، بالاپور، خیریت آباد، لنگر فیض اثر فیل خانہ طویلہ اور کارخانہ جات کے الاوے زیادہ مشہور تھے۔ بلدہ کا الاوہ کوتوال شہر کی تحویل میں تھا۔" ۴ے

حکومت قطب شاہیہ نے مراسم و تقریباتِ محرم کی ترویج کے سلسلے میں بہت زیادہ انہماک اور دلچسپی دکھائی ہے۔ یہ انہماک ضروری بھی تھا کیوں کہ وہ جس تہذیب کی تدوین کر رہے تھے ان میں غم کو اساسی قدر قرار دیا تھا۔ یہ جذبہ غم جو گداز قلب کی حیات کا ضامن ہوتا ہے وہ غم کربلا کی آفاقی قدر ہی حاصل ہو سکتا تھا اسی لئے ان بادشاہوں نے غم کربلا کو عام کرنے میں پورے خلوص کے ساتھ انہماک دکھایا۔

آغاز محرم ہی سے ممالک محروسہ میں تمام الاوؤں کے اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔ الاوہ کے ذمہ داروں کو ہر ممکنہ سہولت مہیا کرتی۔ اور اگر کوئی الاوہ قائم کرنا چاہتا تو اس کو جملہ سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ سبیلوں کے لئے خالی گھڑے کپڑے وغیرہ حکومت دیا کرتی تھی۔ غرض یہ کہ جس زاویہ سے بھی غم کربلا کو عام کرنے کا کوئی راستہ نکل سکتا تھا اس کو ضائع نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایسے راستوں کو زیادہ کشادہ کرنے سے ہر امکان کو توسیع دی جاتی تھی۔ حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ کی سلطنت حیدر آباد میں اور ان کے حکومت سے منسلک ہونے کے بعد اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے گرمی عمل بہت تیز ہو گئی ہے کیوں کہ میر صاحب کا عین منشا وہی تھا جس کی نذر "شرعی" بانی سلطنت قطب شاہیہ سلطان قلی قطب الملک نے کی تھی کہ

"مذہب بحق وصی خیر البشر و ائمہ عشر را دریں مملکت کہ ہرگز بوی از گلشن اسلام ایشان نرسیدہ رواج دہیم۔" ۵ے

ترجمہ: مذہب حقہ وصی خیر البشر اور ائمہ اثنا عشر کو اس مملکت میں وہاں تک رواج دوں گا جہاں اب تک خوشبوئے اسلام نہ پہنچی ہو

باب (۸) حوالے

۱:	حکیم شمس اللہ قادری	آثر قطب شاہیہ	ص ۳۴، ۱۳۳
۲:	نظام الدین	حدیقۃ السلاطین	ص ۴۲ بحوالہ کلیات محمد قلی
۳:	ڈاکٹر زور	کلیات محمدؐ قلی قطب شاہ	ص ۱۵۸ ص ۱۴۵
۴:	حکیم شمس اللہ قادری	آثر قطب شاہیہ	ص ۵۷
۵:	تاریخ گولکنڈہ مخطوطہ	-	ورق ۹۷ و

باب [۹]

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے تصرفات!

آج کی مادیت میں سر تا قدم ڈوبی ہوئی دنیا سینہ تان کر بڑے فخر کے ساتھ اپنی بالغ شعوری، بیدار مغزی، وسیع النظری اور دانشوری کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ وہ ماورائی نظریوں، مابعد الطبعیاتی فلسفوں اور خرق عادات باتوں پر یقین نہیں رکھتی اس فکر و خیال کے لوگ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ انھیں ان واقعات کو قبول کرنے کا کوئی سائنسی اشارہ نہیں ملتا اور کوئی ٹھوس عقلی ثبوت بھی فراہم نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہی لوگ چھٹی حس کے قائل ہوتے ہیں جسے چھٹی حس کہتے ہیں (اس کی دلیل بھی تو نہیں ملتی) دراصل یہ ایک طرح کا فکری نقص ہے۔ معجزہ، کرامت وغیرہ ٹھوس حقیقتیں ہیں ایسی ٹھوس حقیقتیں جن کو بدیہیات میں شامل کیا جا سکتا ہے اور بدیہی حقیقت کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقل جن میدانوں میں مینارۂ نور ہے وہ تو ہے لیکن وہ ہر میدان کے لئے نہیں ہے جہاں تو جیہہ ممکن نہیں ہوتی وہاں عقل کو عاجز ہونا پڑتا ہے عقل کا عجز عجز ہوتا ہے منکر حقیقت نہیں ہوتا۔

ملکوتی صفتوں کو سمجھنا عقل کے بس کا روگ نہیں یہ ایک ملکہ ہوتا ہے جسے اہل عرفان محسوس کرتے ہیں لطف لیتے ہیں وجدان حاصل کرتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے۔ انبیاء، اولیاء اور اوصیا کو چھوڑ کر باقی خاکی انسانوں میں جن عظیم شخصیتوں نے اپنی پاکیزہ زندگی کے نتیجہ میں اپنے میں ملکوتی صفت پیدا کی ہے ان کا تصرف ہر شئے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح رہا ہے۔ جیسے وہ ناپ تول کے بٹوں کو کم تولنے والوں کے لئے حکم دیں تو اسی وقت وہ سزا دے دیں کتوں کو حکم دیں کہ چوری کے ارادہ سے نکلنے والوں کو کاٹ لیں تو وہ حکم کی تعمیل کریں جمادات و حیوانات تک ان

کے تابع فرمان ہوجاتے ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے محض عقیدہ یا عقیدت نہیں ایسی ہی خرق عادت باتیں جن نفوس قدسیہ اور اللہ کے نیک بندوں سے ظہور میں آتی ہیں ان کو عام طور پر بزرگوں کے "تصرفات" کہا جاتا ہے۔ یہ تصرف قطعی حقیقت ہوتا ہے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی کیوں کہ "عیاں راچہ بیاں" ایسی ہستیوں کی فیض رسانیاں لازمانی اور لامکانی ہوتی ہیں۔ اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان کے روحانی فیض سے منکر دنیا بھی فیض پاتی رہتی ہے۔

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ بھی انہی بزرگواروں میں سے ایک ہیں جن کا فیض آج بھی جاری ہے حاجتمند آتے ہیں فیض پاتے ہیں اور علامہ کے عقیدتمندوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ علامہ میں اس نفس قدسیہ کا چمک اٹھنا ضروری تھا۔ انھوں نے شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی علیہ الرحمہ اور حضرت میر محمد مومن علیہ الرحمہ جیسی صاحبان تصرف ہستیوں سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ان میں بھی اس ملکوتی جوہر کا چمکنا ضروری تھا اور وہ ظاہر ہوا۔ علامہ کے صاحب تصرف ہونے کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ علامہ نے کم از کم تین طویل سفر کئے ۱۰۲۵ھ میں سفیر ایران بن کر گئے لیکن اپنا سارا ساز وسامان ساتھ نہیں رکھا۔ ۱۰۴۹ھ عبداللہ قطب شاہ کی پھوپھی یا خالہ اور چند شاہی خواتین کے ہمراہ قزوین گئے لیکن ساز وسامان حیدرآباد ہی میں رہا لیکن ۱۰۵۹ھ میں جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو اس موقع پر اپنا کل اثاثہ مرزا اسد کے ذریعہ ایران بھجوا کر اپنے ورثا میں تقسیم کروادیا۔ اس کے صریحی معنی یہی ہیں کہ علامہ کو یہ علم ہو چلا تھا انھیں موت کے لئے کمر کس لینا چاہئیے ہم نے شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین عاملی علیہ الرحمہ کی وفات کے واقعات میں بھی یہی دیکھا ہے کہ انہیں موت کی غیبی اطلاع قبل از قبل ہوگئی تھی۔

میں علامہ کے مزار پر بچپن ہی سے جاتا رہا ہوں اب بھی جاتا ہوں۔ میں نے عمر کی اس طویل مدت میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ کے مزار پر عقیدتمندوں کی اس وقت بھی ایک خاص تعداد آتی تھی جب مزار پرانی حویلی کی محصورہ دیوار میں تھا اب راستہ پڑ گیا ہے تو زائرین کا ہجوم اور بھی بڑھ گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ علامہ کی زندگی کے اس سرد کو کرن تشنہ چھوڑا جائے شاید ایک طرح کی کوتاہی بھی ہوتی۔

دوسرے یہ کہ میں تو علاّمہ کی سوانح لکھ رہا ہوں۔ سوانح کا یہ پہلو بھی تو زندگی دوسرے پہلوؤں کی طرح تذکرہ کا بجا طور پر حق رکھتا ہے۔ اس رُخ کو چھوڑنا یقیناً دیانت کے خلاف ہوگا۔ میں نے علاّمہ کے مزار پر بیٹھ کر اور دوسرے اپنے ان ساتھیوں سے اصرار کر کے جو علاّمہ علیہ الرحمہ کے مزار پر میری طرح روز آتے ہیں میں واقعات معلوم کئے۔ ان واقعات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے میں ان چند واقعات پر اکتفا کروں گا جو میری نظر میں درست ہیں جن پر شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

ایک دن میں نے رضا میاں سلمۂ (جناب سیّد علی رضا) سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ رضا میاں میرے دوست ہیں مجھ سے خلوص ہی سے نہیں ملتے ہیں بلکہ ان کی مہربانی ہے کہ تھوڑا بہت میرا احترام بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود موضوع کو سنتے ہی یکلخت خاموش ہوگئے۔ بالکل چپ سادہ لی۔ بولے راحت بھائی آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ جانتے ہیں میں علاّمہ پر لکھ رہا ہوں۔ سیرت کے اس پہلو کو بھی تو آخر دُنیا کے سامنے لانا ہی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کردوں جناب علی رضا بڑی کھری کھری دوٹوک بات کرنے والی شخصیت کا نام ہے۔ جو سوچتے ہیں اور جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر ہوتا ہے مصلحت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہوتی۔ اپنے تاثرات کو بیان کرنے میں بھی بہت سیدھے ہیں۔ کسی کو بُری لگے یا بھلی جو کہنا ہوتا ہے کہہ گزرتے ہیں رضا میاں علاّمہ کے مزار پر اُس عمر سے جاتے ہیں جب وہ اپنے بزرگوں کی اُنگلی پکڑ کر چلا کرتے تھے۔ وہ اب بھی رات میں ایک خاص وقت زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ ان کا آنا ایک مقررہ وقت ہے۔

میں نے رضا میاں سلمۂ سے بھی خواہش کی کہ وہ یا تو آپ بیتی بیان کریں جسے بیان کرسکتے ہیں یا پھر چشم دید واقعہ کا ذکر کریں۔ ابھی تک وہ خاموش تھے میں نے فوراً ڈاکٹر زور صاحب کا حوالہ دیا کہ انھوں نے حضرت میر محمّد مومن قبلہ علیہ الرحمہ کی سوانح لکھی اور اس پہلو کو بھی نمایاں کیا۔ بولے۔ راحت بھائی آپ کہہ رہے ہیں تو سُنئے میں بہت بچپن سے علاّمہ کے مزار پر جاتا ہوں۔ آج کل تو مزار پر

روشنی بھی کر دی گئی ہے اس وقت رات میں مزار پہ اندھیرا رہتا تھا۔ میں رات میں جاتا ہوں میرا وقت مقرر ہے میں تو اب بجلی والا اور پھر بیٹے والا ہو گیا ہوں۔ میں نے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے واقعات کی فہرست بڑی طویل ہے، دو ایک واقعات سُنا دیتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کہنے لگے۔ ایک روز میں حسبِ معمول علامہ کے مزار پہ گیا۔ اندھیرے میں میں نے دیکھا ایک خاتون خاموش بیٹھی ہیں میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنی دُعاؤں سے فارغ ہو کر چلا آیا اس طرح میں نے اس خاتون کو میرے ہی اوقات دو تین دن تک اسی حالت میں خاموش بیٹھا دیکھا تو میں کہا بہن اس طرح خاموش بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ پڑھا کریں، میں ایک چھوٹی سی دُعاء بتاتا ہوں آپ اِسے پڑھا کیجیئے مُراد جلد آئے گی اِس خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی چُپ ہو گیا۔ پھر دن گزرتے رہے کچھ دن بعد میں دُعاؤں سے فارغ ہو کر لوٹ رہا تھا کہ اس خاتون نے کہا دیکھئے سُنیئے بھائی صاحب میں بڑی مصیبت میں تھی۔ میرے شوہر نے مجھے کچھ کرا دیا تھا۔ میری زبان بند ہو گئی تھی۔ اس وقت جو میں آتی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے شوہر کام پہ چلے جاتے ہیں۔ میں سیدھے "حضرت" کی درگاہ پہ آجاتی ہوں۔ بس اِسی چپ کے ساتھ دُعاء کرتی تھی "حضرت" نے میری سُن لی اب میں بالکل ٹھیک ہوں اس کے بعد پھر وہ نظر نہیں آئیں۔ اس خاتون کی خوش لباسی اس کے اچھے گھر کی ہونے کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ معاف کیجیئے میں نے آپ کی بات سُنی لیکن اُس وقت جواب نہیں دے سکتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے مزار پہ ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ وہ بھی اسی طرح خاموش بیٹھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ بیٹا یہاں اتنی رات میں کیوں بیٹھی ہو۔ اس نوجوان لڑکی نے کہا "کیا بولوں اس وقت گھر میں ہوتی ہوں تو دل بہت گھبراتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا دل مروڑ رہا ہے۔ میں تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔ یہاں آتی ہوں تو مجھے بڑا آرام ملتا ہے میں "حضرت" سے یہی دُعاء مانگ رہی ہوں کہ وہ مجھے اس تکلیف سے نجات دلوا دیں۔ میں نے اِس لڑکی کو اور

چند روز دیکھا پھر وہ نہیں آئی۔ یقین ہے کہ اس کو شفا ہو گئی ہو گی۔

ایک واقعہ اور سُنئے۔ ایک صاحب ہیں جن کا نام میں بتانا نہیں چاہتا آپ بھی انھیں جانتے ہیں۔ وہ عملیات کے بہت شوقین ہیں۔ میں انھیں بھی کچھ دِن علّامہ کے مزار پر آتا دیکھتا رہا۔ روزانہ علیک سلیک ہوتی تھی۔ میں اپنی دُعائیں پڑھتا تھا۔ میں نے انھیں بھی ایک گوشہ میں پڑھتے ہوئے دیکھا۔ چند ہی دِن گزرے تھے کہ وہ غائب ہو گئے محلہ میں بھی کئی دن تک نظر نہیں آئے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ میرے ذہن میں بھی نہیں رہے۔ ایک دن اچانک مجھے ملے۔ میں نے سلام علیک کے بعد مزاج پُرسی کی اور پوچھا کیوں بھائی آپ کی مُراد پوری ہو گئی۔ آج کل آپ مزار پر تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ وہ بولے ــــ رضا بھائی ــــ وہ بات بالکل مت پوچھئے۔ میں ڈر رہا ہوں۔ بس اِتنا سُن لیجئے کہ علّامہ کے مزارِ مُبارک پر کوئی شخص کوئی عمل عملیات نہیں کر سکتا۔ آپ بھی پڑھتے ہیں ذرا ــ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ میں کوئی عمل نہیں کرتا بھائی۔ ماثورہ دُعائیں پڑھتا ہوں اور انھیں میں عرصے سے پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے ان دُعاؤں کو وہاں پڑھتے ہوئے ایک کیف مِلتا ہے۔

اب میرا اپنا واقعہ سُن لیجئے۔ آپ نے آپ بیتی کی بھی بات کی تھی تو سُنئے:
مجھے وظیفۂ حسنِ خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے (۵) سال ہو چکے تھے۔ بہترین کارگزاری کا شاید یہ صلہ تھا کہ وظیفہ اجرا نہیں ہوا۔ راحت بھائی! مجھے پیردی، خوشامد، گھروں پر حاضری جیسی باتوں سے خُدا واسطے کا بیر ہے۔ میں بھی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گیا کہ دیکھوں کب تک وظیفہ جاری نہیں ہوتا۔ ایک دن دل میں آیا کہ کیوں نہ قبلہ و کعبہ (علّامہ علیہ الرحمہ) سے عرض کردوں کیوں کہ ان سے کہنا تو باعث عزّت بھی ہے اور موجبِ سعادت بھی۔ میں حسبِ معمول مزار پر گیا۔ روزمرہ کی دُعاؤں کے بعد حضرت سے اپنے مسئلہ کو رجوع کیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں نے اپنے وظیفہ کی کارروائی کو آپ کے سپرد کر دیا ہے: جیسے اب تک چپ رہا ہوں۔ آپ سے رجوع ہو کے بھی خاموش رہوں گا کیونکہ

دفتر جاکر اپنی کاروائی کے بارے میں کسی سے نہ پوچھوں گا نہ کسی کی خوشامد کروں گا۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا راحت بھائی! یقین جانیئے۔ اسی ہفتہ میرے محکمہ کے سپرنٹنڈنٹ نے اجرائی وظیفہ کے احکام گھر پر لاکر مجھے دیئے آپ اسے کیا کہتے ہیں۔ یہ علامہ علیہ الرحمہ کا تصرف نہیں تو اور کیا ہے۔ کہاں (۵ سال) کہاں ایک دو دن۔

نواب سید حسین علی خان آسی اگریکلچرل کالج میں برسر خدمت ہیں۔ انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ "میں جس زمانہ میں ملازمت کے سلسلہ میں پریشان تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے میں نے اگریکلچرل کالج میں درخواست دی تھی۔ درخواست اپنی جگہ تھی میں اپنے گھر میں۔ ہست یا نیست کا کوئی اشارہ بھی نہیں مل رہا تھا۔ میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے جہاں جہاں درخواست دی تھی جواب نفی میں مل رہا تھا۔ مایوسی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ ایک دن میں اپنے ایک عزیز نواب احمد حسین خان مرحوم کے پاس بیٹھا تھا باتوں باتوں میں میں نے اپنی مایوسیوں کو بھی بیان کردیا۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا آسی تم لوریاس میں مبتلا ہو! اے بھائی دنیا تو آس اور اُمید پر قائم ہے۔ میں نے کہا نواب آپ مذاق نہ کیجئے۔ مشورہ دیجئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ کہیں کوئی اُمید کی ملکی کرن بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ نواب صاحب نے میری ساری تقریر سن لی مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولے۔ زبردست سہارا گھر کے قریب رکھ کر در در وسیلہ ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ میں نے کہا نواب صاحب میں سنجیدہ بات کررہا ہوں۔ نواب صاحب بولے میاں آسی میں نے کب غیر سنجیدہ بات کی ہے سنو۔ علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کے مزار مبارک پر جاؤ سرہانے بیل کے قریب کھڑے ہوکر (۱۲۵) مرتبہ درود شریف پڑھو اور اس کا ثواب علامہ علیہ الرحمہ کی روح مبارک کو ایصال کرو۔ علامہ علیہ الرحمہ کو درود بے حد عزیز رہا ہے۔ انشاءاللہ تمہارا کام ضرور بن جائے گا۔ میں اسی ہفتہ شب جمعہ سے مزار مبارک پر جانے لگا کچھ روز نہ گزرے تھے کہ اگریکلچرل کالج کے پرنسپل جناب حسین علی خان نے ذریعہ مراسلہ مجھے بلوایا اور میرا تقرر کردیا۔ مجھے بہت جلد بہت سی دشواریوں سے نجات مل گئی۔ اب بھی جب کبھی کوئی کٹھن وقت

آتا ہے یا کسی اُفتاد سے دوچار ہوتا ہوں تو سیدھے
ہوں درود پڑھتا ہوں اور اپنا کام بنا لیا کرتا ہوں۔

جناب مسعود علی مرثیہ خواں بھی ہیں نوحہ خواں بھی۔
کو بھی علاّمہ علیہ الرحمہ سے بڑی عقیدت ہے۔ جب مَیں نے
لکھنے کا ذکر کیا اور اس پہلو کی طرف اشارہ کیا تو بہت خوش ہوئے۔ ب
بڑا کام کر رہے ہیں آپ (مجھے بہت کم نوجوان انکل یا چچا کہتے ہیں ورنہ مَیں
سے زیادہ مخاطب کیا جاتا ہوں) ہاں تو مسعود صاحب نے کہا۔ علاّمہ بڑے رسہ
بزرگ ہیں۔ ان کی مزار پر ہاتھوں ہاتھ مُراد ملتی ہے۔ مَیں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں
اگر کوئی مشکل در پیش ہو یا کوئی کام نہ بنتا ہو تو مزار پر سر مغرب جائیے بیل کو تھام کر
قبلہ رُخ ہو کر دُعا کیجئے انشاء اللہ آپ کا کام جلد ہو جائے گا۔ یہ بات آزمودہ ہے۔
مَیں نے مختلف اوقات میں مختلف حضرات و خواتین سے جو مزار پر زیارت یا فاتحہ
خوانی کے لئے آتے ہیں علاّمہ کے فیض کے تعلق سے سوالات کئے۔ کسی نے بتایا کسی نے
راز رکھا یہ کہہ کر چلے گئے وہ بات بتانے کی نہیں ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا۔ میری
آسیب زدہ لڑکی صحت یاب ہوتی ہی نہیں تھی ہر ملاّ کا علاج کروا کے تھک گیا۔ آخر
میں یہاں لے آیا۔ مَیں نے کچھ نہیں کیا۔ صرف لڑکی کو لاتا اور یہاں بٹھا دیتا تھا تھوڑے
دنوں میں وہ ٹھیک ہو گئی۔

ایک صاحب نے فرمایا۔ کیا بولوں حضت کیا ہیں۔ میری بیوی کا جسم اچانک
سوکھ گیا اور وہ اکڑ بھی گئی تھی (انھوں نے اپنی بیوی سے پیار تعارف بھی کروایا)
چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھی مَیں اس کو اُٹھا کر یہاں لاتا اور صرف بٹھا دیتا تھا۔
تھوڑے دن میں بدن پر گوشت بھی آگیا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ دیکھیے
اب وہ آپ کے سامنے ہے۔ کون اب اس کو بیمار کہے گا۔

علاّمہ علیہ الرحمہ کے مزار پر ایک محترمہ تشریف لاتی ہیں۔ مَیں نے ان کے یہاں
آنے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا بھائی صاحب کیا بتاؤں میری جوان لڑکی ہے
میرے شوہر باہر ہیں۔ ایک مدت سے نہ کوئی خط آتا تھا نہ پیسے بھیجتے تھے

سے یہاں آنے لگی ہوں اللہ کا فضل ہے ہمارے صاحب
بیسے بھی آرہے ہیں۔ اب میں حضت کے پاس ہر روز حاضری

ریں شاہی سوز خوان نے اپنے والد جناب سید عابد حسین مرحوم
ایک اہم واقعہ سنایا۔ جناب عابد حسین مرحوم ۲ صفر کو علی اصغر علیہ السلام
کالتے تھے ۔ جھولا جلوس کے ساتھ اب بھی نکلتا ہے غیر معمولی مجلس ہوتی
ہے یہ مجلس نواب عنایت جنگ بہادر اعلی اللہ مقامہ کی دیوڑھی میں ہوتی تھی ۔
یہ جھولا جلوس کی شکل میں اس دیوڑھی کو جاتا تھا اس کے بعد مجلس ہوا کرتی تھی ۔
کسی سال کسی وجہ سے دیوڑھی میں مجلس نہ ہوسکی ابا علامہ علیہ الرحمہ کے مزار پر آئے
ویسے وہ یہاں فاتحہ کی غرض آیا ہی کرتے تھے ۔ اب دُعاء کے لئے آئے انہوں
نے ایک آواز سُنی "عابد حسین وہ مبارک اور مقدس جھولا یہاں آیا کرے گا ۔ اور
مجلس بھی ہوگی ۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے جھولے کا جلوس مزار پر جاتا ہے
وہاں مجلس ہوتی ہے ۔ پھر جھولا الادہ سرطوق مبارک جاتا ہے وہاں مجلس ہوتی ہے
جناب شبیر علی کا بیان علامہ کے مقام بلند کو ظاہر کرتا ہے انہوں نے ایک خواب
دیکھا تھا جناب شبیر علی خوجہ اثنا عشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور ملت کی
معزز شخصیت ہیں ۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ علامہ علیہ الرحمہ کے مزار کے
اندر اُتر رہے ہیں اور ایک شاندار محل میں داخل ہو گئے ہیں سارا محل فیروزہ رنگ
میں رنگا ہوا ہے اس میں ایک خوبصورت حوض ہے اس میں ایک فوارہ ہے اس
سے جو فوارہ چھوٹ رہا ہے اس کا رنگ بھی فیروزہ ہے ۔ اور اس پانی سے فیروزی
رنگ کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور سارا محل اس فیروزی نور میں ڈوب گیا ہے ۔
جناب قاسم علی ایک سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں ۔ آکاشوانی حیدرآباد
میں ملازم ہیں میں نے انہیں بھی علامہ علیہ الرحمہ کے مزار پر اکثر دیکھا تھا ۔ ایک دن
ان سے بھی علامہ کے تصرفات کے ذیل میں کچھ سوالات کئے ۔ انہوں نے کہا میں
لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں گا ۔ دو تین دن بعد ان کا خط ملا میں اس خط ہی کو

نقل کر رہا ہوں ۔

"محترم المقام عالیجناب راحت عزمی صاحب۔ السلام علیکم امید کہ مع الخیر ہونگے جیسا کہ بالمشافہ آپ سے گفتگو ہوئی تھی اس ضمن میں یہ تحریر ہے۔ امید کہ آپ اپنی تحقیقی تحریر میں غریب کی زندگی یہ تحریر کو جگہ دے کر ممنون فرمائیں گے ۔

میں مسمی محمد قاسم علی ولد میر وزیر علی (مرحوم) ایک عرصہ دراز سے پریشانی اور خستہ حالی کے علاوہ بیماری بھی ایک عرصہ دراز سے جھیل رہا تھا۔ چنانچہ دو اپریشن کے بعد تیسرے اپریشن کے لئے بھی ڈاکٹر نے کہا تو میں گھر واپس آگیا۔ اسی رات میں نے خواب دیکھا ایک بزرگ کہہ رہے ہیں کہ تو علامہ ابن خاتون کے مزار پر جایا کر۔ اور مولا علی کے پہاڑ کو بھی جا خواب ہی میں اسی شدت تکلیف میں میں وہاں گیا۔ یہاں میں نے اسی خواب ہی میں دیکھا میرا اپریشن ہو رہا ہے۔ صبح اٹھا تو درد شکم سے یکدم نجات ملی۔ اور ہاں وہی بزرگ یہ بھی بولے کہ تو علامہ ابن خاتون کے مزار پر فاتحہ پڑھا کر۔ یہاں فاتحہ پڑھنے والا کبھی محتاج نہیں ہوگا۔ انشاءاللہ! سچ جانیئے اسی روز سے میری حالت بدل گئی۔ علامہ کے فیض سے صحت یاب بھی ہوگیا۔ زندگی میں آسودگی آگئی۔ اس وقت سے میں بہ پابندی فاتحہ کے لئے مزار مبارک پر حاضر ہوتا ہوں۔ میں نے اپنے بچہ رضا حیدر کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ علامہ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھا اور دعا کر تو امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ اللہ کے فضل سے اور علامہ کے فیض سے وہ میٹرک میں کامیاب ہوگیا۔"

میں دن رات درود پڑھ کر اس کا ثواب علامہ کی روح کو گزرانتا ہوں۔

والسلام

شرح دستخط (محمد قاسم علی ابن محمد وزیر علی)

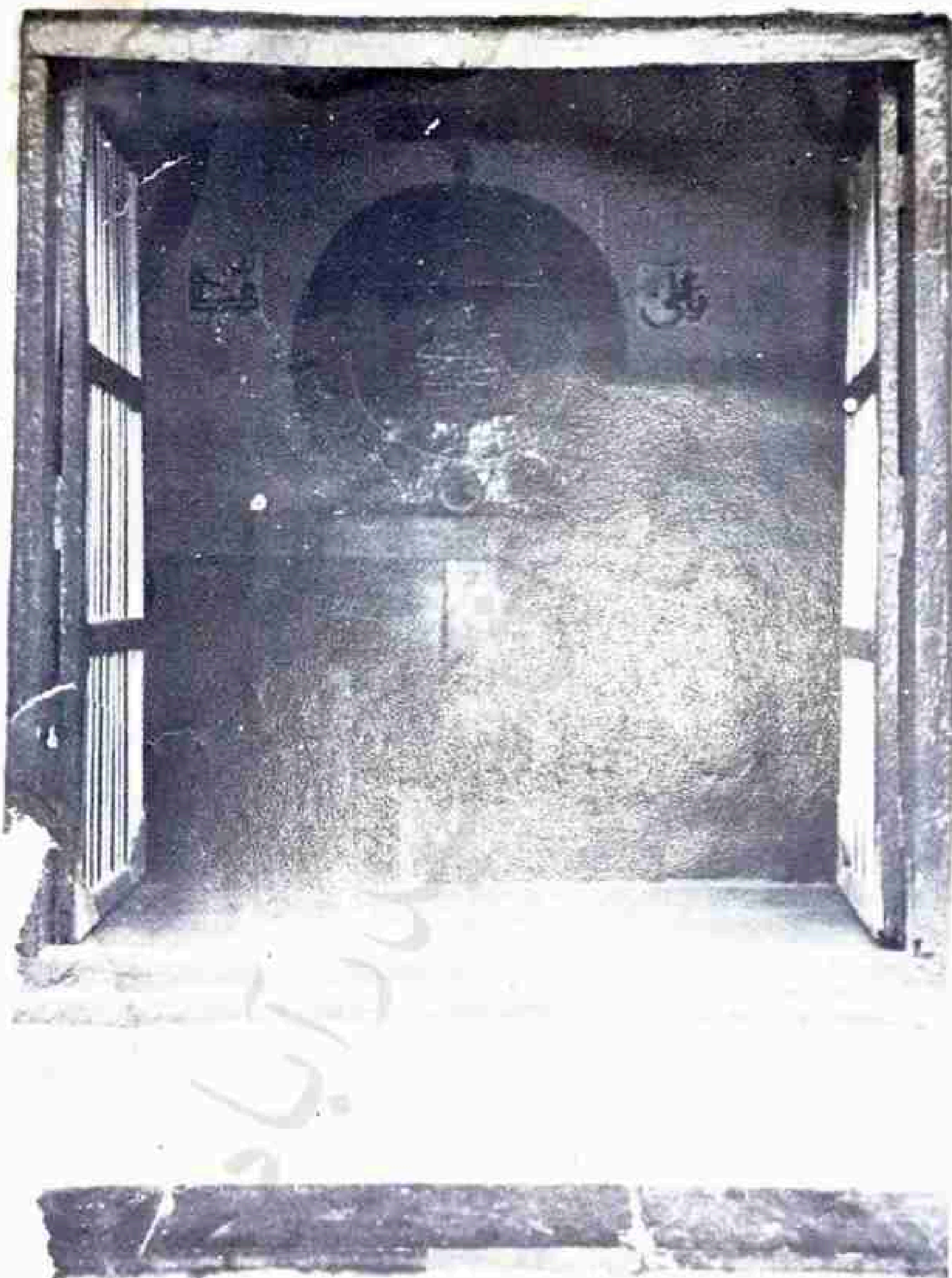
ں کتابوں میں تصرفات و کرامات کے تذکروں میں عمیبیہ
موجودہ ذہن یہ سمجھ کر کہ قصہ ہائے پارینہ ہیں ان پر
بول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے شیر
وں کی اس روش سے گریز کیا ہے۔ میں نے اپنے عہد اور حال
ت و ماضی کے واقعات پر ترجیح دی ہے تاکہ آج کی دنیا میں سائنس والے تصرفات
یقت کو سمجھیں اور اللہ کے نیک بندوں کے اختیار کا اندازہ کریں ان نفوس
سیہ کے جلال و جمال کو سمجھیں، ان کی ملکوتی صفتوں کی روشنی سے اپنے دلوں میں اُجالا
یں اور دل کی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان اللہ والوں کی فیض رسانیاں کس قدر
لا محدود ہیں۔

... اس فیروزی نور میں ڈوب گیا ہے۔
... کا ایک سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔ آکاش وانی حیدرآباد
میں ملازم ہیں۔ میں نے انہیں بھی علامہ علیہ الرحمہ کے مزار پر اکثر دیکھا تھا۔ ایک دن
ان سے بھی علامہ کے تصرفات کے ذیل میں کچھ سوالات کئے۔ انہوں نے کہا میں
لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ دو تین دن بعد ان کا خط ملا میں اس خط ہی کو

علامہ کا عکس تحریر

اما اگر در وقت وضو یا غسل یا تیمم عالم بغصبیت
یا اشتباه نباشد و بعد از نماز اطلاع یابد که غصبی
یا مشتبه بغصبی بوده درین صورت نمازی که کرده
صحیحست سجده هرگاه نداند که یک رکعت کرده
یا دو رکعت ... شک و عدد رکعات نماز مغرب
کردن ... رکنی از ارکان خمسه نماز را که نیت و تکبیر
احرام و قیام و رکوع و دو سجده است زیاده
یا کم کردن ... سهو باشد ... فعل کثیر
در اثنای نماز بجیثیتی که در عرف او را مصلی نگویند
اگرچه سهوا باشد اما اگر فعل قلیل باشد مثل کشتن
کنه یا عقرب را بیک ضرب کشتن یا یک قدم پیش
یا پس رفتن نماز باطل نمیشود سکوت طویل کردن

[illegible]



مزارِ علامہ ابنِ خاتون علیہ الرحمہ

حاصل کلام

زندگی کے تنوع اور تسلسل نے کسی فرد یا معاشرے کے ارتقاء اور استحکام کی شناخت یہ بتائی ہے کہ وہ ایک سیل ہے جو ٹوٹے بغیر وقت کے لمحوں کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس سے صاف اور واضح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہماری زندگی چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی بہرحال ماضی سے جڑی ہوئی ہے۔ ماضی کو فراموش کر کے نہ ہم اپنے حال کا جائزہ لے سکتے ہیں اور نہ سماج کی چھان بین کر سکتے ہیں۔ اگر فکر کو اور ذرا فلسفیانہ زاویوں کی طرف موڑ کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم حال کا جائزہ لے ہی نہیں سکتے۔ صرف ماضی کو دیکھ کر دوسرے ہی لمحہ میں اگلے قدم کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ کیوں کہ حال تو پلک جھپکتے ماضی ہوجایا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں پائدار تمدن رکھتی ہیں یا جن کی تہذیب کے دھارے مسلسل ارتقاء پذیر ہیں ان کی تہوں میں یہی فلسفہ متحرک نظر آتا ہے کہ وہ ماضی کی راہوں سے مستقبل کے راستوں کو نکال لاتے ہیں۔ جن قوموں نے کمہار کے چاک کو دیکھا اور اس کے عمل کا گہرائی سے جائزہ لیا انھوں نے ذرائع حمل ونقل کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے کی کتنی ہی نت نئی راہیں نکالیں۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کوئی فرد یا قوم اپنے ماضی کو بھلا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔

تاریخ، سیرت اور سوانح نے بھی یہی بات بتائی ہے کہ آج کا فرد یا سماج ماضی کو مضبوطی سے تھام کر ہی شاندار مستقبل کی بلند چوٹیوں کو چھو سکتا ہے۔

تاریخ سے زیادہ سوانح اور سیرت کا سرمایہ فرد کی تعمیر میں اہم وظیفہ ادا کرتا ہے۔ اچھے افراد کی کثرت ہی قومی اور تمدنی عظمتوں کو متعین کرتی ہے۔

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی سوانح کے جن رخوں اور پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایسے ہیں کہ بالغ نظر جوان فکر افراد ملت ان رخوں اور پہلوؤں

کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کی مصروفیتوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں اور جائزہ لے کر علامہ کی زندگی سے استفادہ کے اِمکانات پر غور کر سکتے ہیں اور انھیں اپنی زندگی کے لائحہ عمل میں داخل کر سکتے ہیں۔

علامہ کی زندگی بڑی تہہ دار زندگی ہے ان کے یہاں دین و دُنیا دونوں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ علامہ نے دین اور دنیا کے درمیان جو مصنوعی دیوار کھڑی تھی اس کو گرا دیا۔ ان کی نظر میں دین اور دُنیا دو الگ چیزیں یا وحدتیں نہیں ہیں بلکہ وہ جسم کی طرح ایک وسیع اکائی ہے عبادات و معاملات دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں وہ ایک دوسرے سے ایسے مرلوط ہیں کہ ایک ہی ہیں۔

علامہ نے خاص طور پر وقت کے صرف پر زیادہ زور دیا ہے۔ انہوں نے عملاً اس قدر معروف زندگی گزاری ہے کہ ایسی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہر دور میں قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ اسی طرح علمی کاوشوں کے ذیل میں بھی علامہ نے اپنی زندگی کو نمونہ بنا دیا ہے۔

علامہ نے سرکاری ذمہ داریوں کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا اور ہر مرحلہ میں کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ بھی اس میدان میں کام کرنے والوں کو ذمہ داری کا قدم قدم پر احساس دِلاتے ہیں۔ اور احساس فرض کو جگاتے رہتے ہیں۔

علامہ علیہ الرحمہ نے وقت کے مصرف کو بھی اپنے عمل سے خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا ہے اُنھوں نے اپنی ہمہ رُخی مصروفیت کو شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں اس طرح بانٹ دیا تھا کہ کسی لمحہ کو بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ دِن کے نکلنے کے ساتھ صباحی درس شروع ہو جاتا۔ سرکاری کام کا وقت شروع ہوتا تو علامہ مسند پیشوائی پر بیٹھتے امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مصروف رہتے اِسی دوران بادشاہ وقت کے پاس دو مرتبہ باریاب ہونا ہوتا۔ رات میں عشائیہ کے بعد پھر علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہوتا جو دیر گئے تک چلتا رہتا۔ اس کے علاوہ جشن زرگانہ اور تصنیف و تالیف نیز عبادات سب کے سب مقررہ اوقات

میں تکمیل پاتے۔

علامہ کی علمی مجلس کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس بزم میں ہر مکتبہ خیال کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ حد یہ ہے کہ "اصولیوں اور اخباریوں کو"[1] ایک جگہ جمع ہوتے بھی دیکھا گیا ہے۔ علامہ اصولی تھے لیکن اخباری مسلک کے علما بھی یہاں آتے علمی مذاکروں میں حصہ لیتے تھے اس سے علما کے صلح کل اور وسیع النظر ہونے کا ثبوت ملتا ہے وہ نیز علما کی ہر دلعزیزی کی صفت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ صفحات گزشتہ میں علامہ کی زندگی کے جو مناظر پیش کئے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ آج کا ہر وہ نوجوان جو جس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا خواہاں ہے وہ علامہ کی زندگی کے اس پہلو کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا کر کامیابی کی آخری منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

اگر یہ چند سطریں نوجوانوں کے جذبات عمل کو انگیز اور مہمیز کر سکیں تو سمجھوں گا کہ میری محنت جیز ہوئی۔ رائگاں نہیں گئی۔

---

[1] فرقہ شیعہ اثنا عشری میں اصولی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی مجتہد اعلم کی تقلید کرتے ہیں اور اخباری ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو چودہ معصومین کے ارشادات سے مسائل فقہ وغیرہ کے مسائل کو راست اخذ کر کے عمل کرتے ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں محمد امین استرآبادی اخباری نے اخباری مسلک کی تائید میں "دانش نامہ" لکھا تھا۔ اس کتاب نے قطب شاہی حکومت میں رہنے والے شیعوں میں کسی قدر ہلچل مچادی تھی اسی زمانہ میں سید نورالدین نے الفوائد المدینہ اخباریت کی رد میں لکھی۔ علمی دنیا میں اس موضوع پر مباحثے ہوتے رہے۔

علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی علمی محفلوں میں، اصولی اور اخباری دونوں نقاط نظر رکھنے والے علما شریک ہوتے تھے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے مآثر قطب شاہیہ حکیم شمس اللہ قادری۔